ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۷

تیسرا سال: تیسری کتاب

مارچ ۲۰۰۵ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey_90@hotmail.com

angarey@poetic.com

فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ ترکی شاعری میں ایک جدید آواز۔احمد محبّ دراناس — نورای اوزنچ — ۴

۳۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات:۱۵) — ابن حسن — ۸

کہانیاں:

۴۔ ایک پاگل کا روزنامچہ — نکولائی گوگول/ خالد سنجرانی — ۱۸

۵۔ عورت — امر جلیل/ننگر چنا — ۲۶

۶۔ وقفہ — خالد فتح محمد — ۳۱

۷۔ موڑ — طاہر نقوی — ۳۷

تبصرے:

۸۔ ''شیشے کے کنول''۔پس منظر — ڈاکٹر وزیر آغا — ۴۱

۹۔ شوکت نعیم قادری کی تصنیف ''نتائجِ فکر''۔ایک تجزیہ — آسیہ اشرف — ۴۴

غزلیات:

۱۰۔ قاضی حبیب الرحمٰن (پانچ غزلیں)، صابر ظفر (ایک غزلیں)، خاور اعجاز (چھ غزلیں)، فہیم شناس کاظمی (دو غزلیں)، پرویز ساحر (دو غزلیں)، منیر راہی (دو غزلیں)، شفیق آصف (چار غزلیں) عطا الرحمٰن قاضی (سات غزلیں)، شارق بلیاوی (دو غزلیں)، حصیر نوری (چار غزلیں)، شہاب صفدر (دو غزلیں) — ۵۲ تا ۷۲

حروفِ زر:

۱۲۔ قارئیں کے خطوط — بنام مرتب

سید عامر سہیل

چند باتیں

نورای اوزنچ (۱)

ترکی شاعری میں ایک جدید آواز۔ احمد محبّ دراناس

احمد محبّ دراناس بیسویں صدی کے ترکی شعرا میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور تمثیل نگار بھی۔ جدید شاعروں میں نہ صرف اپنے منفرد طرز احساس کی بدولت بلکہ ایک نئی آواز اور جدید تر اُسلوب کے سبب بھی ایک الگ پہچان رکھتے تھے۔ فطرت کے حسین اور بدصورت دونوں پہلوؤں کو اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظموں میں فطرت اور اس کے تلازمات کا حوالہ بڑے تواتر کے ساتھ آتا ہے۔

دورِ جمہوریت کے یہ ترک شاعر ۱۹۰۸ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور وہ سنوپ (۲) میں تعینات تھے۔ چنانچہ دراناس نے اپنی ابتدائی تعلیم سنوپ میں پائی۔ بعد میں ان کے والد کا تبادلہ انقرہ میں ہوا تو وہ بھی ان کے ساتھ انقرہ آئے۔ مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم انقرہ میں مکمل کرنے کے بعد انقرہ یونیورسٹی میں قانون کی فکلٹی میں دو سال تعلیم حاصل کی پھر اسے ادھورا چھوڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انقرہ سے استنبول منتقل ہو گئے۔ استنبول یونیورسٹی کی ادبیات فکلٹی کے شعبۂ فلسفہ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد ''حاکمیت ملیہ'' نامی اخبار کے ساتھ بطور ایڈیٹر وابستہ ہوئے۔ اس کے علاوہ آرٹ اکیڈمی میں انجمن تحفظ طفلان میں اور عوامی گھر کے اداروں میں کام کیا۔

نوجوانی کے عالم میں لکھی گئی پہلی نظم ۱۵ ستمبر ۱۹۲۶ء میں ''قومی مجموعہ'' رسالے میں شائع ہوئی۔ دراناس نے روزمرہ زندگی کے پیش آمدہ مسائل کو نہیں بلکہ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم مسائل کو شعروں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ فرانسیسی شاعر چارلس بودلئر اور ترکی شاعر نجیب فاضل سے متاثر ہو کر انہوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان سے ہٹ کر اپنی الگ راہ نکالی اور پرانی روایتی شاعری سے نکل کر پُر اثر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے جو ترکی کے لوگوں میں خاص جذبہ اور ولولہ پیدا کرتی تھی۔ ہائی سکول کے زمانے میں مشہور ترک شعرا فاروق نافظ اور احمد حامدی سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا کیونکہ وہ ان شعرا سے بے حد متاثر تھے۔

جب احمد محبّ دراناس اغری (۳) میں فوجی تربیت حاصل کر رہے تھے تو اغری نامی ایک طویل نظم لکھی۔ اس نظام اور فاروق نافظ کی نظم ''کاروان سرائے کی دیوار'' میں خاص مماثلت پائی جاتی ہے

''اغری جیسا عظیم پہاڑ نہیں میرے دل میں
کس قدر بونا ہوں درد اور مسرت میں

وہ افق میں پھیلا ہے جس کو دیکھتا ہوں

بے آس، نراس، ایک تاریک رات میں'' (کلیات، ص ۱۲۹)

دراناس کے ہم عصر شاعر ملیح جودت کہتے ہیں کہ ''دراناس ایک سچا اور حقیقت پسند شاعر ہے وہ اپنے من میں ڈوب کر شاعری کرتا ہے۔'' (۴) دراناس شاعری اور تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ موسیقی اور مصوری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جب مڈل سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو اس وقت انہوں نے دو مختلف قسم کے ساز بجانے بھی سیکھے۔ لیکن اس بارے میں کہ وہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے کسی کو علم نہیں تھا۔ عوام میں وہ ایک سچے شاعر اور تمثیل نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔

دراناس نے اپنی ساری زندگی میں ایک عشق کیا اور وہ اپنی خوب صورت اور من پسند بیوی سے، جس کو وہ بے حد پیار کرتے تھے۔ انہوں نے منیرہ الکر سے ۱۹۴۰ء میں شادی کی اور اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہوئے کہ ان کے لیے بے شمار نظمیں تخلیق کیں۔ ایک نظم یوں ہے:

''ایک پرندے کی آواز آتی ہے تمہارے ہونٹوں سے
تمہاری آنکھیں نرگسی ہیں جو میرے دل میں کھلتی ہیں
جب تم اپنی کھڑکی سے ایک گل پھینکتی ہو تو
نور سے بھر جاتا ہے میرا دل
گزرتا ہوں موسم کی طرح تمہارے دروازے سے
آنکھوں میں بادل، بالوں پر شبنم لیے۔'' (کلیات، ص ۱۸)

دراناس خود کہتے ہیں کہ میں نے ساری زندگی اپنی شاعری کے سپرد کر دی (۵)۔ انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں۔ لیکن سب سے مشہور نظم ''فخریہ آپا'' کی وجہ سے ترکوں کے دلوں میں سما گئے۔ دراناس ایک ریڈیو پروگرام میں یوں کہتے ہیں ''میرے سارے اشعار ایک طرف اور میری نظم ''فخریہ آپا'' ایک طرف۔ وہ نظم اس قدر مشہور ہوئی کہ بچہ بچہ نہ صرف اسے گنگنانے لگا بلکہ ترکی میں اس پر ایک فلم بھی بنائی گئی۔ میری پہچان صرف وہی ایک نظم ہے جس نے عوام میں مجھے روشناس کرایا اور جسے بے حد پسند کیا گیا۔'' (۶) ایک بند کچھ اس طرح ہے:

''ہوا کوئلے کی تیز بو سے بھر جاتی
بند ہو جاتے دروازے سورج ڈوبنے سے پہلے
پرافیون کی طرح بے ہوش محلے سے
میرے تخیل میں صرف تم ہی تم رہ جاتیں
تمہاری آنکھیں، تمہارے دانت اور بہت سفید تمہاری گردن
ہماری پڑوسن تھیں تم، کس قدر خوب صورت تھیں تم فخریہ آپا۔'' (کلیات، ص ۸۷)

دراناس نے ہمیشہ خوب صورت اور حقیقت پسند شاعری کی۔ اپنی شاعری کو اولاد کی طرح پیار کیا اور پیار ہی سے سینچا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے شاعری کو دل سے اپنایا۔ اپنی بیوی اور اپنے متعلق اس موضوع پر ایک نظم لکھی۔

''ایک ویران نہر کے کنارے پر دو درخت
جوان، صحت مند، ہرے بھرے
بہت سی باتیں ہیں لیکن کس کو بتائیں گے
اس لیے ہمیشہ چپ رہتے ہیں۔'' (کلیات، ص ۲۰۱)

دراناس ۱۹۵۰ء میں جمہوری پارٹی (Democrat Party) میں شامل ہوئے۔ اس پارٹی کے بارے میں ''ظفر'' نامی اخبار میں سیاسی مضامین لکھنے لگے۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے دراناس کو بطور سیاسی شخصیت کے پسند نہ کیا اور بے زاری ظاہر کی۔ ۱۹۶۴ء میں جاری ہونے والے ''حصار'' نامی رسالے میں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ٹوٹے ہوئے گھڑے کی مانند پیش کیا۔ لوگوں کے منفی رویے کی وجہ سے وہ قدرے دل گرفتہ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں ایک بھرا ہوا گھڑا تھا
الٹ دیا اسے لوگوں نے۔'' (حصار، ص ۳)

پچاس برس تک ان کی شاعری کسی مجموعے کی صورت میں سامنے نہ آئی۔ لیکن ۱۹۷۴ء میں ان کا مجموعہ چھپ گیا۔ اس مجموعے کو انہوں نے اپنی پیاری بیوی کے نام منسوب کیا اور لکھا کہ ''سب شعر میرے الہام میں آپ کی وساطت سے آئے ہیں۔'' (۷)

دراناس نے تھیٹر کے لیے تین ڈرامے لکھے۔ انہوں نے ''سائے'' نامی تمثیل لکھ کر ۱۹۴۶ء میں .C.H.P (۸) تمثیل مقابلے میں انعام حاصل کیا۔ انہوں نے مختلف تراجم کیے۔ بودلئر کے علاوہ دوستوسکی کے ناولوں کو بھی ترکی میں منتقل کیا۔ دراناس کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں گویا اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مایوسی کی حالت میں اشعار لکھے۔

''بڑھاپا آیا میرا سورج ڈوب رہا ہے
رات قریب آئی ہے
حیلہ ساز خاموش اندھیری رات
جانتا ہوں وہاں کوئی نہیں ہو گا
کھو جاؤں گا گھٹا ٹوپ اندھیروں میں'' (کلیات، ص ۲۲۷)

اور

''وقت ہرگز نہیں چھوڑتا کسی کو

مجھے ڈھونڈے گا، مار ڈالے گا'' (کلیات، ص۱۷۲)

دراناس جو ہماری شاعری کی تاریخ میں ایک تازگی اور جدید غنایت لے آئے جون ۱۹۸۰ء میں انقرہ میں انتقال کر گئے اور تاریخی شہر سنوپ میں دفن ہوئے۔ دراناس کی یاد ترک لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی شاعری کی خوشبو ترکی کے گوشے گوشے میں سدا پھیلتی رہے گی۔

حواشی:

۱۔ نورای اوزنچ، ریسرچ سکالر، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکی۔
۲۔ سنوپ (Sinop) ترکی کا ایک شہر۔
۳۔ اغری (Agri) ایک جگہ کا نام بھی ہے اور ایک پہاڑ کا نام بھی۔
۴۔ ملیح جودت، دراناس/تحریریں، آدمی اشاعت، استنبول، جون ۱۹۹۴ء۔
۵۔ ''کلیات'' از احمد محبّ دراناس، اش بنک کلچر مرکز استنبول، ۱۹۷۴ء، ص۴۔
۶۔ تومریس گریتلی اوغلو، احمد محبّ دراناس/تحریری ثبوت، ۱۹۸۵ء (TRT Web)
۷۔ کلیات، ص۲ (مقدمہ)۔
۸۔ جمہوری عوام پارٹی کی طرف سے دیا جانے والا انعام۔

☆☆☆

ابن حسن

نکولائی گوگول/ ڈاکٹر خالد سنجرانی

ایک پاگل کا روزنامچہ

[گوگول (۱۸۵۲ء-۱۸۰۹ء) افسانے کی دنیا کے اولین باسیوں میں سے ہیں۔ ان کے افسانے ''اوورکوٹ'' کا بہت شہرہ ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام افسانہ نگار اسی سے برآمد ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں New American Library of World Literature کے اشاعتی منصوبوں نے جہاں دیگر تاریخ ساز کام کیے تو وہاں ایک کام گوگول کے افسانوں کی فراہمی، چھان پھٹک اور اشاعت پر مبنی تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے گوگول کے دیگر افسانے منظر عام پر آئے جو کسی بھی طور ''اوورکوٹ'' سے کم نہ تھے۔ The Diary of a Madman اسی مجموعے سے لیا گیا ہے جس کا مرکزی کردار خبط عظمت میں مبتلا ہے۔ افسانے کا حسن ایک سطح پر ٹھہری ہوئی نفسیاتی حالت کو بیان کرنے سے عیاں ہے۔ دیکھا جائے تو عالمی افسانے کی اولیں روایت افراد کی باطنی زندگی سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ گوگول کا یہ افسانہ اس لیے بھی آج مزید توجہ کا حق دار ہے کہ افسانے کے آغاز میں رئیلزم کی تکنیک نے مدتوں تک خون کو گرمائے رکھا جس کے سبب تجریدی افسانے کے اولیں نقوش منظر عام پر نہ آ سکے۔ یہ افسانہ واضح کرتا ہے کہ افسانے کے آغاز ہی میں ہر دو مزاج کے افسانے منظر عام پر آئے تھے لیکن گوگول کے اس مصرعے کو اُٹھانے والے شاید اس دور میں نہ تھے۔ (مترجم)]

☆☆☆

۱۴۳ اپریل ۲۰۰۰ء

سپین کی عوام کے لیے آج یادگار دن ہے جو خوشیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے اپنا بادشاہ ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ بادشاہ میں ہوں۔ ان لوگوں نے اور میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔ یہ یک لخت مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ میں ہی سپین کا بادشاہ ہوں۔ اس بلند مرتبے پر فائز ہونے کے بعد یہ خیال کتنا ذلت آمیز ہے کہ میں گزشتہ زندگی میں سول سروس کا ایک معمولی کلرک تھا۔ نہ جانے کیوں اس طرح کے ادنیٰ خیالات اب بھی کسی چور دروازے سے میرے ذہن میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب یہ سوچنا کتنا مسرور کن ہے کہ کسی کا قیاس مجھے پاگل خانے بھجوانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پہلے پہل بہت سے معاملات اور باتیں میرے لیے مبہم تھیں۔ نہ جانے تب مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھند میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اب ہر چیز مجھ پر اتنی ہی واضح ہے جتنا کہ یہ پھل جو میں نے اپنی ہتھیلی پہ رکھا ہوا ہے۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تمام تر الجھنیں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ ہم خود ہی انہیں اختراع کر لیتے ہیں اور انسانی ذہن

ہی تمام الجھنوں کا مرکز ہے۔ یہاں سے یہ ساری پیچیدگیاں ہماری اپنی غلط فہمی کے سبب یوں ابھرتی ہیں کہ جیسے کھیتوں کے کنارے کسی پیڑ کا تنا زمین سے اپنا سر نکالتا ہے۔ شاید یہ سب ان سمندری ہواؤں کے سبب سے ہوتا ہے جن کی زد میں آ کر انسانی ذہن ہچکولے کھانے لگتا ہے۔

ماروا نے مجھے سب سے پہلے پہچانا۔ جب اس نے یہ سنا کہ اس کے سامنے سپین کا بادشاہ کھڑا ہے تو اس نے مرعوب ہو کر محتاجوں کے سے انداز میں اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے۔ وہ تو شاہی جاہ وجلال سے تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی۔ اس بے چاری نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی سپین کے بادشاہ کو جو نہ دیکھا تھا۔ بہرحال، میں نے اسے پرسکون کرنے کے لیے مربیانہ لہجہ اختیار کیا اور اسے شاہی آشیرباد ملنے کا ہر ممکن یقین بھی دلایا۔ لیکن ہر مرتبہ معاملہ ماروا کے حق میں صرف اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ وہ بدبخت میرے جوتوں کو مناسب طور چمکانے میں ناکام رہتی تھی۔ وہ بے چاری جب بھی میرے سامنے آتی، از حد سہمی ہوئی ہوتی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ سپین کا ہر بادشاہ فلپ دوم جیسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اسے بارہا بڑی احتیاط سے سمجھایا کہ میں فلپ دوم کی طرح ہرگز نہیں ہوں۔ میں دربار بھی نہ گیا مجھے دربار سے سخت وحشت ہے۔

دوست! اب یہاں تم مجھے مزید ورغلا نہیں سکتے کہ میں اب تمہارے لکھے گئے الفاظ کی دوبارہ نقل اتاروں۔

☆☆☆

۱۰/اکتوبر ۸۶، دن اور رات کا درمیانی وقت

آج ڈویژنل چیف نے میرے پاس ایک آدمی بھیجا کہ وہ مجھے دفتر جانے پر رضامند کرے۔ میں گزشتہ تین ہفتوں سے اپنے دفتر نہیں گیا۔ اس آدمی کے بے حد اصرار پر میں دفتر صرف اس لیے گیا کہ اس بہانے دل لگی بھی ہو جائے گی اور وقت بھی کٹ جائے گا۔ دفتر میں ڈویژنل چیف یہ توقع لگائے بیٹھا تھا کہ میں سیدھا اس کے پاس جا کر پاؤں پکڑ لوں گا لیکن میں نے اسے بالکل سرسری نظر سے دیکھا کہ جس میں نہ تو طیش تھا اور نہ ہی خیر سگالی کی چمک۔ اس کے بعد میں اردگرد کے لوگوں کی کٹیلی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ میرے چاروں طرف سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میں کسی کو دیکھتا تو وہ جھٹ سے تیز تیز لکھنے کی اداکاری کرنے لگتا۔ اے مالک! یہ کیسے لوگ ہیں جو میرے اردگرد پھیلا دیئے گئے ہیں۔ ان سرگوشیوں میں اگر تو بھی شامل ہے تو پھر اس ہنگامے کو میں کیا نام دوں۔ کچھ ان ہونی کا خدشہ ہے۔ کوئی کھیل تیار کیا جا رہا ہے۔ ڈویژنل چیف تعظیم کے لیے میرے سامنے آ کر جھکنے والا ہے۔ ہو بہو اسی انداز میں کہ جیسے وہ ڈائریکٹر کے سامنے جھکتا ہے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے میرے سامنے کچھ کاغذات رکھ دیئے جو میرے لیے مبہم تھے۔ مجھے کبھی بھی عقوبت زدہ ماحول میں کام کرنا پسند نہیں رہا۔

چند لمحوں بعد ڈائریکٹر کے آنے کی اطلاع پر دفتر میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ بہت سے کلرک

اپنی کرسیوں تک چھلانگیں لگا کر پہنچے کہ انہیں ڈائریکٹر کی نگاہِ شفقت کی امید تھی لیکن میں بالکل بے نیازانہ بیٹھا رہا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب بھی کبھی ڈائریکٹر کے بارے میں یہ اطلاع آتی ہے کہ آج وہ ہمارے شعبے سے گزر کر اپنے دفتر جائے گا تو نہ جانے کیوں لوگ جھٹ سے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرنے لگتے ہیں میں نے اس قسم کی کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ یہ کہاں درج ہے کہ ڈائریکٹر کی آمد پر اپنی جگہ سے اُٹھا جائے۔ وہ تو ایک بوسیدہ کارک ہے جسے بوتل میں صرف اس لیے ٹھونکا جاتا ہے کہ مائع باہر نہ گرے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ دفتر کے ان تمام تر معاملات میں سب سے عمدہ بات یہ ہوئی کہ یار لوگوں نے میرے سامنے کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ دراصل یہ میری برطرفی کا نامکمل پروانہ تھا۔ میں نے اپنی برطرفی کے احکامات جاری کر دیئے۔ حکم نامے پر جہاں ڈائریکٹر درج تھا وہاں میں نے اپنے دستخط کیے۔ اس کے بعد وقار کے ساتھ میں نے ہوا میں ہاتھ بلند کیے اور اپنے آپ سے تزک و احتشام کے ساتھ گویا ہوا:

''وفاداری اور اس کی شہادتوں کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں خود اپنے آپ کو برطرف کرتا ہوں۔''

اپنے آپ کو برطرف کرنے کے بعد سب سے پہلے میں نے ڈائریکٹر کے گھر کا رخ کیا۔ وہ گھر پر نہ تھا۔ دربان نے مجھے اندر جانے سے روکنے کی بڑی کوشش کی۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے بازوؤں کی سلامتی اسی میں ہے کہ یہ میری راہ میں حائل نہ ہوں۔ اس کے بعد میں سیدھا زنان خانے میں جا گھسا۔ وہاں اس کی بیوی آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے اچھلی اور مجھ سے دُور ہونے کے لیے پیچھے ہٹنے لگی۔ اس وقت تک میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں سپین کا بادشاہ ہوں۔ میں نے اسے ایک سادہ سی بات بتائی کہ باوجود اس کے ہمارے دشمن ہر طرف سازشوں کا جال پھیلا رہے ہیں لیکن دنیا دیکھے گی ہم بالآخر ایک ہو جائیں گے۔ اس سے میں نے یہ بھی کہا ابھی اسے اندازہ ہی نہیں کتنی بڑی بڑی خوشیاں اور کامرانیاں اس کی زندگی کی چوکھٹ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ مزید کچھ کہنا میری شان کے منافی تھا، اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔

اس بھری دنیا میں صرف میں ہی ہوں کہ جسے عورت کا درست ادراک حاصل ہوا ہے۔ میرے علاوہ کوئی بھی عورت کی حقیقت کو نہیں جان پایا۔ یہ خطہ دریافت کرنے والا میں واحد اور آخری فرد ہوں۔ عورت صرف لچھے دار اور چٹپٹی باتوں سے پیار کرنے والی مخلوق ہے۔ عورت کو رام کرنے کے لیے صرف یہی حربہ کارگر ہے۔ آہ! عورت ذات کتنی بے وفا ہے۔ خیال رہے کہ میں یہ بات شاہانہ وقار اور سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اس میں طنز یا مزاح کا شائبہ تک نہیں۔

☆☆☆

تاریخ ندارد

ہر شخص اپنی ٹوپی اُتار کر مجھے تعظیم دے رہا تھا۔ جواباً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ آج میں نے بڑی احتیاط سے دن گزارا۔ میں نے لوگوں کے سامنے کوئی ایسا تاثر نہیں چھوڑا جس سے لوگ یہ اندازہ قائم

کرسکیں کہ میں سپین کا بادشاہ ہوں۔ اس کی بھی ایک نازک وجہ ہے۔ دراصل عام لوگوں کے سامنے اپنی شناخت کو عام کرتے پھرنا جاہ وحشم کے منافی تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ معاملہ عدالت میں اُٹھانا چاہیے۔ وہی ایک مقام ہے جو میرے مرتبے کے ہم پلہ ہے۔ تاہم، میں نے عدالت جانے سے اجتناب کیا۔ محض اس لیے کہ میرے پاس سپین کے شاہی خاندان کا خاص لباس نہیں تھا۔ اگر میں آج شاہی خاندان کے تزک واحتشام کی کوئی ظاہری نشانی حاصل کر پاتا تو کوئی بھی قوت مجھے عدالت جانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ پھر میں نے شاہی لباس سلوانے کا سوچا لیکن صد افسوس کہ درزی خاصے احمق واقع ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ آج کل انہیں اپنے کاروبار کو وسعت دینے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے اور یہ لوگ ایسی سرمایہ کاری سے ناواقف ہیں جو کثیر منافع کا باعث ہو۔ یہی وجہ ہے جو زیادہ تر درزی آج کل بڑی پتلی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں سے مایوس ہو کر میں نے اپنے اس بہترین کوٹ کو شاہی چوغے میں تبدیل کرنے کا سوچا جسے میں نے اب تک صرف دو مرتبہ ہی پہنا تھا۔ دراصل، میں یہ بھی تو نہیں چاہتا اس پروقار کام کا بیڑہ کوئی عام شخص اُٹھائے۔ اس لیے میں نے اس کام کو خود ہی سرانجام دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ میں نے دروازہ بھی مقفل کر دیا تاکہ اس پر کسی عام شخص کی نگاہ نہ پڑے۔ میں نے قینچی ہاتھوں میں پکڑ کر کوٹ کی قطع و برید کا کام شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ کوٹ ایک انوکھی وضع کے لباس کی صورت اختیار کر گیا۔

☆☆☆

تاریخ (یاد نہیں)

مہینہ (یاد نہیں کر سکتا)

معلوم نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔

آج لباس تیار ہوا۔ جب میں نے اسے پہنا تو مارو ا مارے خوشی کے چلا اُٹھی۔ اس کے باوجود میرا ذاتی خیال ہے صرف لباس ہی کی بنیاد پر عدالت میں چلے جانا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ میرے خدام ابھی تک سپین سے نہیں آئے۔ جب تک وہ نہ آ جائیں تب تک میرا جاہ وجلال اور تزک و احتشام ادھورا ہے۔ کسی بھی لمحے ان کی آمد متوقع ہے۔

☆☆☆

یکم

خدام کی آمد میں تاخیر میرے لیے باعث تشویش ہے۔ انہیں نہ جانے کس امر نے روکا ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں آج مجھے ڈاک خانے جانا پڑا۔ خیال تھا کہ شاید خدام بذریعہ ڈاک وہاں آ گئے ہوں لیکن پوسٹ ماسٹر خاصا احمق نکلا۔ اسے معاملے کی سنگینی کا قطعی احساس نہ تھا۔ ''نہیں'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔ پھر وہ حیران کن انداز میں بولا کہ ہمارے یہاں سپینی وفد کی آمد کی کوئی اطلاع وغیرہ تک نہیں۔ تاہم، اگر آپ کو کوئی خط وغیرہ بھجوانا ہے تو ہم یہ خدمت بسر وچشم قبول کریں گے۔ نہ جانے وہ کس خط کی

بات کر رہا تھا گدھا کہیں کا۔ شاید اسے میری شان وشوکت کا اندازہ نہ ہوا۔ ورنہ کہاں خط، کہاں میں ہوں۔ صرف منشیات کے عادی مجرم ہی خط لکھنے اور بھیجنے کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

☆☆☆

میڈرڈ،

فرووری ی

طیرھویں

آج میں سپین پہنچا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ مجھے خود اس کا اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ سب کچھ کس وقت ہوا۔ بالآخر آج صبح سپینی وفد میری خدمت میں حاضر ہو گیا اور ہم سب ایک بگھی میں سوار ہو گئے۔ میں نے سفر کے دوران ہی میں ایک نہایت شستہ تقریر کی۔ ہم بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور آدھ گھنٹے میں ہم سپین کی سرحد پر تھے۔ دراصل سارے یورپ میں ریل اور سبک رفتار بحری جہاز موجود ہیں اور مسافتیں جلد طے ہو جاتی ہیں۔

یہ سپین بھی عجیب خطہ ہے۔ جب ہم پہلے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں میں نے لوگوں کا جمِ غفیر دیکھا۔ سبھی کے سر مُنڈے ہوئے تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ کی کہ یہ سب ڈومینکی (راہب) اور قابوچی ہیں کہ جو اپنے سروں پر بال نہیں آنے دیتے۔ مشیر اعلیٰ جو اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے میرے لیے رہ نمائی کا فرض ادا کر رہا تھا، کچھ عجیب سا واقع ہوا تھا۔ اس نے مجھے ایک کمرے کے اندر دھکیلا اور چلا کر کہا: ''یہاں چپ چاپ بیٹھ جاؤ اور خبردار اب دوبارہ اپنے آپ کو بادشاہ فرڈیننڈ نہ کہنا، ورنہ میں اس چھڑی سے تمہارے دماغ کی یہ ساری گرمی باہر نکال دوں گا۔'' مجھے معلوم تھا کہ مجھے آزمایا جا رہا ہے۔ میری صداقت کسوٹی پر رکھی جا رہی ہے۔ مشیر اعلیٰ نے اپنی چھڑی سے مجھے دو مرتبہ اس زور کا پیٹا کہ میں بلبلا اُٹھا۔ اس وقت میں نے اپنے ذہن میں اس بات کو تازہ کرتے ہوئے اپنے حواس برقرار رکھے کہ اس طرز کا سلوک یہاں کے امراء میں رواج کی حیثیت رکھتا ہے اور بلند مرتبت گروہ میں شمولیت اسی باضابطہ رسم کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اسی دن سے یہ حسنِ سلوک سپین کے بادشاہ کے لیے موجود رسوم میں باضابطہ طور پر شامل ہو گیا۔

اپنے بلند مرتبے اور مقام کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ریاستی امور میں دل چسپی لینا شروع کی اور حکومتی اقدامات کے لیے کچھ وقت نکالنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے میں نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا کہ چین اور سپین اصل میں دونوں ایک ملک ہیں۔ ان خطوں کے باشندے اگر اپنے اپنے علاقوں کو الگ الگ ملک قرار دینے پر مصر ہیں تو یہ ہماری کوتاہی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ میں نے استدلالی انداز میں لوگوں سے کہا کہ اس امر میں اگر کسی کو بھی شک ہے تو وہ کاغذ پر لفظ "Spain" لکھے اسے خود ہی محسوس ہو جائے گا کہ یہ لفظ "Spain" بنیادی طور پر "China" ہی سے ماخوذ ہے۔ اس ملاقات میں،

میں نے لوگوں کو مستقبل کے خطرات سے بھی آگاہ کیا۔ میں نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ معروف برطانوی کیمیادان ولنگٹن نے اس بات کا سراغ لگایا ہے کہ اب وہ وقت آنے کو ہے جب ہماری یہ زمین چاند سے بھی بلند ہو جائے گی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس وقت چاند کے بھربھرے پن اور زمین کی بے پناہ کشش کے خیال نے مجھے ایک لمحے کے لیے دہلا دیا تھا۔ چاند یقیناً ہیمبرگ میں بنا۔ تاہم، میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی بنت میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اور بُرے ڈھب پر اس کی تشکیل کی گئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس معاملے میں برطانیہ اب تک خاموش ہے۔ افسوس کہ چاند بنانے میں لوہے کے کاری گروں نے حصہ لیا۔ خاص طور پر ان کاری گروں نے جو جست کے بیضوی ٹب اور ڈونگے بنانے میں ماہر تھے۔ انہوں نے سونے اور چاندی کے تاروں اور مختلف دھاگوں کو استعمال نہیں کیا کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ چاند ہوتا کیا ہے۔ صد افسوس کہ ان کاری گروں نے چاند کو تارکول کی رسیوں اور زیتون کے تیل سے بنایا۔ اسی وجہ سے زمین کے چاروں طرف ایسی سرانڈ پھیلی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنے ناک ڈھانپنے پڑتے ہیں اور انسان چاند پر نہیں رہ سکتا۔ صرف اپنے ناک کی وجہ سے۔ اگر انسان ناک نہ رکھتا تو اس کا چاند پر رہنا ممکن تھا۔ ہم اپنے ناک اس لیے نہیں دیکھ سکتے کہ وہ چاند پر ہیں۔ میں نے سوچا کہ چاند اور زمین کے اس تصادم میں سب سے زیادہ نقصان ہمارے ناک ہی کا ہوگا۔ چاند انہیں پیس کر پاؤڈر میں بدل دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی جرابیں اور جوتے پہن کر سٹیٹ کونسل روم کی طرف دوڑا تاکہ وہاں جا کر پولیس فورس کو یہ حکم دوں کہ وہ زمین کو چاند سے بلند ہونے سے روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرے اور اس سانحے سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت چوکس رہے۔ وہاں پر کچھ چالاک صفت قابوچی پہلے سے ہی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا: ''چاند کے تحفظ کے لیے ہنگامی اقدامات کیے جائیں۔ زمین اس پر چڑھائی کرنے کے لیے تیاریاں کر رہی ہے۔'' میرے حکم کی تعمیل میں وہ سب دیواروں پر چڑھ گئے تاکہ چاند تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ اسی لمحے مشیر اعظم کہیں سے آنکلا۔ سب لوگ ادھر اُدھر کھسک گئے۔ بادشاہ ہونے کی وجہ سے میں اکیلا ہی کھڑا رہا۔ میری حیرت اس وقت بڑھ گئی جب مشیر اعظم مجھے لاٹھی سے ہانکتے ہوئے میرے کمرے تک لے گیا اور بند کر دیا۔ سپین کی درخشاں روایات اپنے اندر یہی قوت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

جنوری جو ہر سال فروری کے بعد آتا ہے۔

میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ سپین کیسا خطہ ہے۔ یہاں کی عدالتوں کی روایات اور آداب محیر العقل ہیں۔ میں انہیں نہ تو سمجھ سکا اور نہ ہی ان پر کوئی گرفت کر سکا۔ وہ لوگ جب میرا سر مونڈنے لگے تو میں پورے شاہی رعب و دبدبے سے گرجا لیکن ان لوگوں نے اس مزاحمت کی قطعاً پروا نہ کی۔ آج میرا سر مونڈ دیا گیا۔ ان لوگوں نے یہ ظلم کیا کہ سر مونڈنے کے بعد یخ بستہ پانی میرے منڈے ہوئے سر پر

انڈیل دیا۔ میں خالی الذہن ہو گیا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ مجھے اس قسم کی اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں اس انوکھی، احمقانہ اور ناقابل فہم رسم کی اصل غایت سمجھنے میں ناکام رہا۔ وہ بادشاہت جو اس قسم کی لاقانونیت کو اپنے غیر ذمہ دارانہ رویے کے سبب تقویت دیتی ہے، میری ہی قائم کردہ ہے۔ میرے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔

میری زندگی میں دھیرے دھیرے کچھ ایسی علامات ابھرنے لگیں کہ جن سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ احتسابی قوتیں میرے گرد اپنا شکنجہ سخت سے سخت تر کرتی چلی جا رہی ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں نے مشیر اعظم کے طور پر جس شخص کا انتخاب کیا ہے، ممکن ہے وہ فطرتاً احتساب پسند ہو۔ حالات خواہ جو بھی ہوں، مجھے یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ کوئی بادشاہ احتسابی اور تفتیشی قوتوں کے درمیان گھر جائے۔ ممکن ہے کہ یہ چال فرانس یا پولینگ کی ہو۔ پولینگ گندگی کے ڈھیر سے کسی بھی طور کم نہیں۔ اس نے مجھے قبر میں اُتارنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ روز بروز آگے ہی آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن میری جان! مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاتمہ برطانیہ کے ہاتھوں ہوگا۔ برطانیہ کے لوگ بڑے بالغ نظر سیاست دان ہیں۔ انہوں نے ہر طرف نا اتفاقی اور پھوٹ کے بیج بو دیئے ہیں۔ اس فصل پر جب پھول آئیں گے تو انہیں برطانوی سونگھیں گے لیکن چھینکیں فرانس لے گا۔

☆☆☆

۲۵ تاریخ

آج محتسب اعلیٰ میرے کمرے میں آیا۔ میں اس کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔ وہ ابھی دُور ہی تھا کہ میں کرسی کے نیچے جا چھپا۔ کمرے میں آنے کے بعد اس نے ادھر اُدھر دیکھا، مجھے وہاں نہ پا کر مجھے میرے نام اور سول سروس کے عہدے سے پکارا۔ میں خاموش رہا۔ پھر جب اس نے فرڈیننڈ ہشتم، بادشاہ سپین کی آواز لگائی تو اس آواز پر میں چونکا۔ اس طرح توہین آمیز انداز میں پکارنا مجھے ناگوار گزرا۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ میرے منڈے ہوئے سر پر پھر سے ٹھنڈا پانی انڈیلنا چاہتے ہیں۔ اس دوران میں محتسب نے مجھے کرسی کے نیچے چھپی ہوئی حالت میں دیکھ لیا اور اپنی چھڑی لہراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے بے رحمانہ پیٹا گیا۔ میں صرف اس خیال کی وجہ سے چپ رہا کہ یہ سب شاہی رواج ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر ظالم الگ سے اپنا ایک سپین رکھتا ہے اور اپنی مملکت کو اپنے ظالمانہ اصولوں کے ڈھب پر چلانا چاہتا ہے۔ محتسب سزاؤں وغیرہ کا عندیہ دے کر غیض و غضب کی حالت میں لوٹ گیا۔ میں نے اس کے لاچار غضب کو محسوس کر لیا تھا کہ وہ برطانیہ کا محض ایک مہرہ ہے جسے خود سے چال چلنے پر کوئی اختیار نہیں۔

☆☆☆

تاریخ ۳۴

ماہانہ، سالانہ فرو ۳۴۹

آج میں بہت نقاہت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھ میں اب دنیا کا مزید سامنا کرنے کی طاقت نہیں۔ میرے مالک! دیکھ یہ لوگ میرے ساتھ کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ یہ میرے منڈے ہوئے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں۔ میری بات نہیں سنتے۔ یہ لوگ مجھے اتنی اذیتیں دینے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟ یہ لوگ مجھ سے آخر چاہتے کیا ہیں؟ میں ان کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ جب کہ میرے پاس کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا۔ میرے پاس اب مزید ہمت باقی نہیں جو میں ان کے مصائب سہہ سکوں۔ مجھے اپنا سر آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں پر رکھا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ میرے اطراف میں دائروں کا سلسلہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے محفوظ رکھ۔ مجھے یہاں سے اُٹھا لے۔

میرے مالک! میرے لیے آسمانوں سے ایک ایسی بگھی اُتار جس میں سبک رفتار گھوڑے جتے ہوئے ہوں، ہواؤں سے بھی زیادہ تیز گھوڑے۔ کوچوان! گھنٹی بجا اور ان گھوڑوں کو اوپر کی سمت ہانک، اتنا اوپر کہ جہاں کچھ بھی نہ ہو۔ یہ سامنے آسمان ہے جو دھواں ہو رہا ہے۔ وہ دور کہیں ایک ستارہ جھلملا رہا ہے۔ جنگلات اپنی گھنی چھاؤں کی تاریکیوں میں ہلال ٹانکے ماضی کی طرف جست بھر رہے ہیں۔ میرے پاؤں تلے بنفشی دھند کا فرش ہے۔ گٹار کے کسے ہوئے تار جھنجھنا اُٹھے ہیں۔ میں یہ موسیقی سن رہا ہوں۔ میرے ایک طرف سمندر ہے۔ دوسری طرف جھونپڑیوں کا سلسلہ شاید اسی سلسلے کے اندر وہ سامنے میرا گھر ہے جس کی کھڑکی سے لگی بیٹھی عورت میری ماں ہے۔ ماں! اپنے اس غریب بیٹے کو بچا لے۔ دیکھ تیری دنیا کے لوگوں نے اسے کتنا ستایا ہے۔ اس وقت تیرے بیٹے کے لیے امان گاہ صرف تیری کنکنی گود ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس غریب کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تمہارے آنسو اس لاچار کے ننگے سر پر گر رہے ہیں۔ لوگ تیرے بیٹے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ماں! اپنے بیمار اور قابل رحم بیٹے کو مادرانہ شفقت دے۔

ویسے آپس کی بات ہے کہ کیا آپ نے الجیریا کے حکمران کے بارے میں یہ سن رکھا ہے کہ اس کی ناک کے نیچے دائیں طرف ایک مہاسہ ہے۔

☆☆☆

امر جلیل/ننگر چنا

عورت

وہ تھکے ہارے قدم اُٹھاتا ہوا کالج کے کمپاؤنڈ سے گذر کر کلاس رومز کے سامنے والے برآمدے میں پہنچا۔ اس کا دل بے حد اُداس تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بغیر کسی سبب کے آنسوؤں کی لڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ اس کے من میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ تمام طلبا پوری توجہ کے ساتھ پروفیسر کا لیکچر سن رہے تھے۔ اس نے طلبا کی ہر قطار اور ہر ڈیسک کو غور سے دیکھا، لیکن کملا اسے نظر نہیں آئی۔ اس کا درد کچھ اور بڑھ گیا۔ اسے اپنے جوڑ جوڑ میں تھکن اُترتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر اس کی نگاہوں کے آگے وہی آنسوؤں کی لڑی جھلملانے لگی۔

وہ ڈوبتے ہوئے دل اور روتے ہوئے چہرے کے ساتھ کالج کے گارڈن کی طرف چلا آیا۔ تمام طلبا کلاسوں میں تھے۔ وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اسے لگا کہ اس وسیع و عریض دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ تنہائی نے اس کی مایوسیاں سمندر سے بھی گہری کر دی تھیں۔ وہ پیپل کی چھاؤں میں بازوؤں کو سرہانہ بنا کر سبزے پر لیٹ گیا۔ اس کے دل نے اس سے پوچھا کہ کملا آخر کیوں اسے ستا رہی ہے؟

وہ ایک ہفتہ سے غیر حاضر ہے اور پھر وہ اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگا، ''ہاں۔ کملا ایک ہفتہ سے غیر حاضر ہے آخر وہ سمجھتی کیوں نہیں کہ میں اسے دل سے چاہتا ہوں۔ میری محبت میری پوجا ہے۔ میں اسے پوجتا ہوں۔ ہاں، اس کی پوجا کرتا ہوں۔ وہ میرے مَن۔ مندر کی دیوی ہے، لیکن دیویاں کسی کو ستاتی تو نہیں ہیں۔۔۔ تو پھر کملا ایک ہفتہ میری نظروں سے اوجھل رہ کر مجھے کیوں تنگ کر رہی ہے!''

اس نے گردن پھیر کر اس بینچ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا، کملا ایک مرتبہ وہاں بیٹھی تھی اور وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

''ستیش! تم پاگل ہو'' کملا نے کہا تھا۔

اور جواب میں اس نے سر جھکا کر اُس کے پاؤں چوم لیے تھے۔ کملا حیرت زدہ ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر ستیش کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔ ستیش کی نگاہیں کہہ رہی تھیں، ''کملا! میری دنیا تم ہو۔ میری بہار تم ہو، میری شفق تم ہو۔ میرا پیار تم ہو۔ میری پوجا تم ہو، کملا!''

اور آج وہ اس کملا کے لیے تڑپ رہا تھا، جس کملا کی اس نے پوجا کی تھی۔ اس نے انتظار کرتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ کملا کے بغیر کچھ نہیں، اس کے بغیر اس کا وجود اپنے معنی کھو دے گا۔ پھر اچانک کملا گارڈن کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ ستیش سارے شکوے شکایتیں بھول گیا اور اس کے چاروں طرف مسرت کے گلاب کھلنے لگے۔

''اوہ کمو!'' اس نے بازو وا کرتے ہوئے کہا، ''میری کمو! میری کملا!''

کملا وہیں دروازے پر ہی کھڑی رہی اور وہاں سے اپنے ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیے۔

آسمان سے خون کے قطرے برسنے لگے۔

کملا کے ہاتھوں پر مہندی کے روپ میں ستیش کی حسرتوں کا خون تھا۔

پھر وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔

کملا عورت تھی۔۔۔۔اس کی محبوبہ!

☆☆☆

پھر تمام دنیا کی محرومیاں، مایوسیاں اور اُداسیاں ایک دُکھی انسان کے حصے میں چلی آئیں___ ایسے ہی تمام دنیا کا پورا اندھیرا ستیش کے لیے تھا، تمام دنیا کے کانٹے فقط ستیش کے لیے تھے، پوری دنیا کی ناکامیوں کا زہر صرف ستیش کے لیے تھا اور زہر ستیش کی رَگوں میں دوڑنے لگا۔ اس کی مسرتیں لُٹ گئیں، ارمان لُٹ گئے اور اس کا آرزوؤں بھرا دل ٹوٹ گیا: اسے ایک عورت کے پیار میں روتی آنکھیں، ویران اور منتشر ذہن، جلتے جذبات اور اپنے ہی دل کے ٹکڑے نصیب ہوئے۔

آخر وہ کب تک برداشت کر سکتا تھا! اس کا پورا بدن ایک عورت کی بے وفائی میں جل رہا تھا۔ صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا اور اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ رحم کے جذبہ کو اس نے شراب میں ڈبو دیا تا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو، اپنی لٹی ہوئی دنیا کو، اُجڑی اور ویران دنیا کو بھلا سکے___ اور بھلا سکے کہ ایک عورت نے اسے پیار میں دھوکہ دیا اور اپنی مجبوری کا سہارا لے کر فریب کیا۔

ایک رات اس نے خوب پی۔ شراب اس کے بدن میں داخل ہو رہی تھی اور اس کا ذہن درد کے تمام احساسات سے نجات پا رہا تھا۔ وہ آخری پیگ پی کر بار سے باہر نکل آیا۔ اس کے ذہن میں سکون تھا، آرام تھا۔ وہ ویران سڑکوں کی ٹیوب لائٹس کی روشنی میں چمکتے ہوئے راستوں پر بے سُدھ چلتا رہا اور پھر جب ہاسٹل کے باہری گیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ گیٹ بند ہو چکا ہے اور ہاسٹل کے دونوں چوکیدار سامنے برآمدے میں سوئے ہوئے تھے۔ اس نے دیوار پھلانگنا مناسب نہ سمجھا۔

اس کے لڑکھڑاتے قدم ایک بلڈنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس عمارت کے ایک فلیٹ میں ایک عورت رہتی تھی، جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کودا تھا اور ایک ہی گھر میں پلا بڑھا تھا۔ جس دن اس عورت کی شادی ہو رہی تھی۔ اس دن ستیش بے حد اُداس اور مایوس تھا اور مہمانوں کے درمیان اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور پھر جب پھیروں کی رسم پوری ہو گئی اور منڈپ کی آگ سرد پڑ چکی، تب اس کی آنکھیں برس اُٹھیں۔ وہ کیلے کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر چھوٹے بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگا___ اور کیلے کا پودا بھی اس کے ساتھ سرد آہیں بھرنے لگا۔ پھر وہ عورت اس کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ اور گال پھیرنے لگی۔ اس نے عورت کے سینے سے اپنا چہرہ اُٹھایا اور اپنی

پرنم آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ عورت نے اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

''تمہارے بِنا اُس گھر میں میرا دل نہیں لگے گا، چندرا!'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی، ستیش!'' عورت کی مانگ میں بھرا سندور ستیش کے ہونٹوں پر چپک گیا، ''میرا نیا گھر بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

اور اس وقت وہ اس عورت کے پاس جا رہا تھا۔ عمارت کی سیڑھیوں پر لڑکھڑاتا ہوا وہ فلیٹ کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے بیل پر اُنگلی رکھی اور اندر گھنٹی بج اُٹھی۔ وہ انتظار کرتا رہا اور پھر دوبارہ بیل بجائی۔ کچھ دیر کے بعد اس عورت نے دروازہ کھولا۔ ستیش کے منہ اور کپڑوں سے اُٹھنے والی شراب کی بو عورت کو سخت ناگوار لگی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ستیش اندر داخل ہونے کے لیے ایک قدم اندر بڑھ آیا، لیکن عورت اس کے آگے آ گئی۔

''نہیں، ستیش!'' اس نے کہا، ''میرا گھر تم ایسے اوباشوں کے لیے نہیں ہے۔''

''چندرا!''

''اپنی زندگی تو تم برباد کر ہی چکے ہو۔ اب میری زندگی مت برباد کرو۔ نکل جاؤ۔ ستیش! چلے جاؤ۔ آج کے بعد میری دہلیز پر قدم مت رکھنا۔'' عورت نے اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

ستیش کا درد پھر جاگ اُٹھا، اس کے زخم اور گہرے ہو گئے۔ وہ سر جھکا کر سیڑھیاں اُتر آیا۔

چندرا عورت تھی۔۔۔۔۔۔۔اس کی بہن!

☆☆☆

جب ایک انسان کی حسرتیں خاک میں مل جاتی ہیں جب قدم قدم پر انسان کو ٹھوکریں نصیب ہوتی ہیں، جب منزل نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور جب انسان رات کی تاریکی میں اور دن کی روشنی میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے، تب وہ سہارے تلاش کرتا ہے۔

ستیش کو بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے ایک بہانے کی ضرورت تھی، جس کے سہارے وہ جی سکے۔ ورنہ اس کی سب امیدیں اور تمنائیں مٹ چکی تھیں۔ اسے قدم قدم پر دھوکے ملے، ہر موڑ پر فریب ملے اور پھر اس کی تمناؤں کے دیپ بجھ گئے۔ اب زندگی کی تاریک راتوں کے لیے بس ایک جگنو کی ضرورت تھی، تا کہ وہ زندہ رہ سکے۔ وہ قدرت کے قانون کے مطابق زندہ تھا، لیکن اس کا دل مر چکا تھا۔

ایک دن ستیش کو یاد آیا کہ زہر کا علاج زہر ہے اور پھر اسے شانتی نے سہارا دیا۔ اسے درد بھرے گیت سنا کر اس کے زخموں پر مرہم رکھا۔ وہ اسے پیار دے کر اس کے ماضی کے زخم مٹاتی رہی اور وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ شانتی نے اسے جینے کا ڈھنگ سکھایا، اسے زندگی کی اقدار کی اہمیت سمجھائی اور

پھر اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ شانتی کی محبت نے ستیش کو جھکا دیا اور اس نے سمجھا کہ شانتی ہی اس کے درد کی دوا ہے۔ شانتی عورت کا مکمل روپ ہے، شانتی کے گیتوں میں گنگا اور جمنا کی روانی ہے ___ اور اس نے شانتی کو اس محبت کے بدلے سب کچھ دے دیا۔ اسے سکون کی تلاش تھی، آرام کی جستجو تھی، تو پھر وہ کیوں نہ سب کچھ اس کو دے کر اس کی محبت اور پیار خرید لیتا!

پھر اچانک ایک دن شانتی نے اس سے منہ موڑ لیا۔ شانتی کی توجہ کسی اور طرف ہوگئی۔ اس کے گیت اور دل فریبیاں ان کے لیے رہ گئے جن کے پاس دینے کے لیے کچھ تھا۔ لیکن ستیش تو سب کچھ دے چکا تھا اور ایک دن کنگال ستیش کو شانتی نے اپنے کوٹھے سے دھکے دے کر نکال دیا۔ یہ بڑی شدید چوٹ تھی، یہ ضرب بڑی کاری تھی اور اس فریب میں اذیت ناک تکلیف تھی۔ ایک عورت نے ایک بار پھر اسے شیشے کے ٹکڑوں پر پھینک دیا تھا۔ شانتی عورت تھی ___ ایک ویشیا!

☆☆☆

مسلسل ظلم نے اس کا سینہ داغ داغ کر ڈالا تھا۔ زمانہ نے اسے جی بھر کر ستایا تھا۔ بدتر حالات نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ قدرت نے اس کا مذاق اُڑایا اور دنیا نے اس کے مجروح دل پر قہقہے لگائے اور وہ اپنا غم بھلانے کے لیے شراب خانوں اور سجائے ہوئے کمروں میں بھٹکنے لگا۔ وہ اپنی دلجوئی کے لیے ان کمزور سہاروں کو تھامے رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ وہ سہارے جن سے دنیا کو نفرت ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سب لوگ اس سے دُور ہوتے گئے، لیکن وہ لاپرواہ ہوگیا۔

اب ستیش کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا اور اسے کھانسی میں خون اُگلنا پڑ رہا تھا۔ تپ دق نے اسے اچھوت بنا دیا۔ اس نے ایک دن ان بڑے شہروں سے منہ موڑنے کا فیصلہ کر لیا اور پوسٹ آفس سے ایک عورت کو تار بھیجا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے کوٹ کا کالر اُٹھائے ایک گاڑی میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ گاڑی اسے اپنی منزل کی طرف لیے جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک سٹیشن آتے رہے، مسافر چڑھتے اور اُترتے رہے۔ کسی کی منزل آئی اور کوئی منزل کے لیے سوار ہوا۔ کھڑکی سے آنے والی سرد ہوا کے جھونکے اس کے جسم میں خنجر کی طرح کھب رہے تھے۔ اس کے سینے میں درد کی ایک تیز لہر اُٹھی۔ سرد ہوائیں تپ دق کے لیے موزوں نہیں تھیں۔ اسے کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سینے کو دبائے رکھا۔ وہ کھڑکی میں جھول سا گیا۔ گاڑی کے مسافر جیسے سب کچھ سمجھ گئے۔ سب کی نظروں میں حقارت تھی اور نفرت سے ان کے نتھنے پھولنے سکڑنے لگے۔ ستیش نے سب کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے کھڑکی کی چوکھٹ میں اپنے بازو پر سر رکھ دیا اور اس کا دوسرا بازو باہر جھولتا رہا۔ ہزاروں خیال اس کے دماغ میں بڑی سرعت کے ساتھ اُبھرتے اور ڈوبتے رہے۔ کملا، چندرا اور شانتی کی تصویریں اس پردۂ خیال میں روشن ہوگئیں۔

کملا اس کی دیوی تھی، اس نے محبت کے نام پر اس کی پوجا کی۔ چندرا اس کی بہن تھی، جس

نے اسے اوباش اور آوارہ جان کر دھتکارا اور شانتی ایک ویشیا تھی، جس نے اسے جھوٹا پیار اور نقلی محبت دے کر سب کچھ چھین لیا۔

کملا، چندرا اور شانتی، عورت کے مختلف روپ تھے اور عورت کے مختلف روپ تھے اور عورت نے ہر روپ میں اس پر ظلم کیا، اسے روند ڈالا، ستایا، لُوٹا اور آخر میں اسے زندگی کی اذیت ناک مایوسیوں، محرومیوں اور تاریکیوں میں دھکیل دیا۔

اور اب پھر وہ ایک عورت کے پاس جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ لوٹ جائے۔ وہ عورت کا چوتھا روپ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ خوف لاحق تھا کہ اگر عورت کے چوتھے روپ نے بھی پیار کی بجائے نفرت دی یا اس سے منہ موڑ لیا تو پھر وہ ایک لمحہ بھی جی نہیں پائے گا اور اس کی روح زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہے گی۔ اسے لوٹ جانے کا خیال آیا۔

لیکن اگلا اسٹیشن اس کی منزل تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عورت کا چوتھا روپ دیکھنے سے پہلے گاڑی کے ساتھ آگے چلا جائے۔ اچھا ہے کہ سب کچھ پیچھے رہ جائے۔ اس نے کمزور آنکھوں اور سرد نگاہوں سے ایک بار پھر اپنی منزل، مطلوبہ اسٹیشن دیکھا اور آنکھیں بند کر دیں۔

دفعتاً اس کے کانوں میں ایک کانپتی اور لرزتی ہوئی آواز پڑی، ''ستیش! میرے لال!'' اس نے تھکی پلکیں اوپر اُٹھائیں۔ عورت سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر اس عورت کو دیکھتا رہا۔ عورت نے اس کی سوکھی لکڑی ایسی انگلیاں، زرد کمزور چہرہ اور اداس آنکھیں دیکھ لیں۔ اس نے اپنے بازو وا کر دیئے اور دوبارہ پکارا،

''میرے لال! میرے ستیش!! اتر آؤ، میری جان!''

گاڑی سرکنے لگی تھی۔ ستیش نے عورت کی آنکھوں میں سمندر کی لہریں دیکھ لیں، پیار کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ساگر دیکھ لیا اور پھر اس نے چلتی ہوئی گاڑی سے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا بچا کھچا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔ اس کی سانس اکھڑ گئی۔ پھر اُسی کھانسی نے اسے نڈھال کر دیا۔ عورت اس کے قریب بیٹھ گئی اور اسے اُٹھا کر ایک چھوٹے بچے کی طرح اپنی گود میں بٹھا لیا۔ وہ کھانستے جا رہا تھا، اس کے سینہ میں چھریاں چل رہی تھیں اور پھر خون کی قے کر دی۔ عورت نے سارا خون اپنے کانپتے ہوئے کمزور ہاتھوں میں بھر لیا۔ پیار کا ساگر اُمڈ پڑا، ''تم نے کیا کر دیا ہے؟ میرے لال! میری روشنی!''

عورت نے اُس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ چوم لیا۔ ستیش نے نحیف آواز میں کہا، ''کچھ بھی نہیں۔۔۔ اب میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا، جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' پھر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھل اُٹھی، دونوں کی آنکھوں میں محبت کے کوندے لپکنے لگے اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

یہ عورت اس کی ماں تھی۔

☆☆☆

خالد فتح محمد

وقفہ

وہاں رات گزارنا اُن تینوں کی مجبوری تھی!

تلیٹی پر ہل سٹیشن کی ٹریفک پولیس کا مستقل ناکہ ہے۔ اس پوسٹ کا اپنے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ جب بھی لینڈ سلائیڈ کی خبر آئے تو اوپر جانے والی ٹریفک وہیں روک لی جاتی ہے۔ اُس شام ٹریفک کم تھی اور لینڈ سلائیڈ ان تین کاروں کے گزرنے کے بعد ہوا تھا۔

اچانک بادل آئے اور طوفانی بارش شروع ہوگئی۔ ابھی سورج غروب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا اور لگتا تھا کہ شاید اگلی صبح ہی نہ آئے۔۔۔ لینڈ سلائیڈ کے مقام سے تھوڑا پہلے اُنہیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔۔۔ اور تینوں کو رات وہیں گزارنا تھی!

کمرے میں صوفہ اور پلنگ تھا۔ دروازے کے سامنے دیوار کی لمبائی کے رخ ایک کھڑکی تھی جس کے آگے پردہ کھنچا ہوا تھا۔ پردہ نہ بھی کھنچا ہوتا تو طوفانی بارش کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آ سکتا تھا۔ صوفے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔۔۔ اور لالٹین کی زرد روشنی نے کمرے کو حیرت کدہ بنا دیا تھا۔

آدمی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے بریف کیس ٹانگوں پر رکھ کر ایسے پکڑا ہوا تھا جیسے اُس کے چھن جانے کا خطرہ ہو۔ وہ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ میں چیف انجینئر تھا اور اُس کی ساری عمر سڑکیں بناتے گزری تھی۔ وہ پچھلے چوبیس برسوں سے دسمبر کے آخری اور شروع سال کے چند دن یہاں گزارتا۔ یہ تعطیل بارہ دن کی ہوتی۔ پچیس دسمبر کو اُس کی شادی ہوئی تھی۔ تب وہ ایک ہونہار اور محنتی اوورسیئر تھا۔ یہ لیبل ملازمت میں اُس کے ساتھ چپکا رہا۔ اب تک دشوار گزار علاقوں میں ہر سڑک اُس کی زیرِ نگرانی بنی تھی۔

اُس کی شادی ایک جاہ طلب عورت سے ہوئی تھی۔ وہ جلد ہی آدمی کے ہیٹ، کالے شیشوں والی عینک اور سڑکیں بننے کی رفتار سے اُکتا گئی۔ وہ عورت زندگی میں حرکت کی خواہاں تھی چنانچہ اُس نے پورے ایک سال بعد پچیس دسمبر کو آدمی سے چھٹکارہ حاصل کر لیا۔ شادی کی پہلی سالگرہ آدمی نے اُسی ہل سٹیشن پر منانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

پچھلے چوبیس برسوں سے آدمی ہر رات دو بڑے پیگ لے رہا تھا کبھی کبھار وہ اِس مقدار میں اضافہ کر لیتا لیکن ایسے مواقع انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ وہ سورج غروب ہوتے ہی پہلا گھونٹ لیتا۔ آدمی کے بریف کیس میں بوتل اور گلاس تھا۔ اُس نے پانی کے لیے اردگرد نظر دوڑائی تو صوفے کے ساتھ

اُسے غسل خانے کا دروازہ نظر آیا۔

کمرے میں دو عورتیں بھی تھیں۔ آدمی الجھن میں گرفتار تھا، کیا آج شام وہ پی سکے گا!

بڑی عورت پردے کے کونے میں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پردے کو ہٹانے سے خائف تھی کہ بارش شیشہ توڑ کر اندر ہی نہ آ جائے۔ اُس کی کوشش تھی کہ بارش کی دیوار کے پار دیکھ سکے تاکہ اُسے کسی طرح وہاں سے نکلنے کا راستہ مل جائے۔

اُس کی شادی تیرہ برس پہلے ہوئی تھی۔ خاوند اعلیٰ سرکاری ملازمت میں تھا جس نے شادی کے تیسرے دن اُسے بتایا کہ وہ ہر رات تھوڑی مقدار میں پیتا ہے۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اُس کا ذہن ایک طفلانہ رومانیت سے بھر گیا تھا۔ اُس نے انگریزی فلموں میں خاوندوں کو ہلکے سرور کی کیفیت میں اظہارِ محبت کرتے دیکھا ہوا تھا۔ ایسے سین اُس کے لیے ایک انوکھا لطف رکھتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا خاوند بھی ویسا ہی رویہ اپنائے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔ جب خاوند نے پیگ بنایا تو وہ چکرا گئی۔ کمرے میں کسیلی بو پھیل گئی تھی اور اُسے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ وہ فوراً تازہ ہوا میں سانس لینے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر کے بعد اُسے ابکائی محسوس ہوئی۔ اُس نے قے تو نہیں کی لیکن دوبارہ اُس بو میں سانس نہیں لیا۔

اُس عورت کی ایک اور اُلجھن بھی تھی۔ اُس کا خاوند اتنے اونچے خراٹے لیتا کہ سونا مشکل ہو جاتا۔ اگر اُس کی آنکھ کبھی لگ جاتی تو اُن کی خوابگاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگتا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور اپنی نیند ہمیشہ گھر سے باہر پوری کرتی۔

اُس کا بیٹا ہل سٹیشن کے ایک سکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ اپنی جماعت میں ہمیشہ آخری پوزیشن لیتا۔ سکول کا دستور تھا کہ چھٹیوں میں نالائق طلبا کو اضافی کوچنگ کے لیے روک لیا جاتا۔ صبح پچیس دسمبر کی چھٹی تھی اور اُسے دن اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا تھا۔ اِس دن کے انتظار میں دو دن سے سو نہیں سکی تھی۔ خاوند کی مصروفیت کی وجہ سے وہ خوش بھی تھی کہ بیٹے کے ساتھ رہنے کے علاوہ جی بھر کے سو بھی لے گی۔

وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ خوب سونا چاہتی تھی لیکن کمرے میں اجنبیوں کی موجودگی۔۔۔؟

چھوٹی عورت پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کی نظریں اپنی گھڑی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ بارش کے شور میں اُسے اذان سنائی نہیں دے گی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی پانچ منٹ رہتے تھے۔

وہ اس علاقے کے موسم سے بخوبی واقف تھی!

اُس عورت نے ہل سٹیشن کے کانونٹ میں دس سال گزارنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اُس کا باپ ایک صنعت کار تھا جس کی اولین ترجیح اپنی اولاد کو تعلیم کے زرہ بکتر سے لیس کرنا تھا۔ وہ اپنے گھر کے تضادات کا شکار تھی۔ اُس کا باپ زندگی میں جدید رجحانات سے لپٹنے کو کہتا جب کہ ماں ہمیشہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کی تلقین کرتی۔ اِس ماحول میں رہتے ہوئے وہ دہرا معیار اپنانے پر مجبور

تھی۔ اُسے زندگی کے بیباک رنگ بھی پسند تھے اور وہ نماز بھی قضا نہ کرتی تھی۔ یہ تضاد اُس کی زندگی کا حصہ بن گیا!

اُس کا کانونٹ کی مدرسپیریئر کے ساتھ بہت ہی قریبی تعلق تھا۔ مدرسپیریئر کو اُس کی راست گوئی بہت پسند تھی۔ سکول میں اگر کسی شرارت کا سراغ نہ ملتا تو مدرسپیریئر ہمیشہ اُسے طلب کرتیں۔ وہ اُن سے کبھی جھوٹ نہ بولتی۔ اس کی دوست ناراض تو ہوتیں مگر اسے نظرانداز بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

مدرسپیریئر کے ساتھ اُس کی ہمیشہ خط و کتابت رہی۔ وہ ہر کرسمس مدرسپیریئر کے ساتھ گزارتی۔ پھر چھبیس دسمبر کو انہیں اپنے ساتھ میدنوں میں لے جاتی کیونکہ سردی اب مدرسپیریئر کی برداشت سے باہر ہونے لگی تھی۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ نماز کے لیے اُٹھی تو تینوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار غور سے دیکھا!

چھوٹی عورت نے نماز ختم کر کے دونوں کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ بڑی عورت پردے کے ساتھ سہمی کھڑی تھی اور آدمی بریف کیس مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ چھوٹی عورت نے سرسری طور پر ان دونوں کو بتایا کہ بارش کم از کم تین گھنٹے نہیں رُکے گی۔ آدمی اور بڑی عورت اچانک چونک اُٹھے۔ بڑی عورت نے گھبراہٹ میں گھڑی دیکھی۔ اُس نے سوچا کہ بارش آٹھ بجے تک چلے گی اور اوپر سے لینڈ سلائیڈ! اب شاید اتنی دیر ہو جائے کہ سفر کرنا ممکن ہی نہ رہے۔ وہ خود کو کوسنے لگی کہ ڈرائیور کو ساتھ کیوں نہیں لائی تھی۔ نیند اُس پر غلبہ کیے جا رہی تھی اور پلنگ پر کوئی اور تھا!

چھوٹی عورت کو آدمی کافی مضحکہ خیز لگا۔ اُس نے سوچا شاید بریف کیس ہی اُس کے تناؤ کا سبب تھا! اُس نے اُسے بریف کیس کو پلنگ کے نیچے رکھنے کا مشورہ دیا کیونکہ گھنٹوں سے زیادہ وہاں محفوظ ہوگا۔

آدمی کا پینے کا وقت ہو چکا تھا۔ اُسے ایک بہانہ چاہیے تھا جو چھوٹی عورت نے مہیا کر دیا۔ اُس نے سخت لہجے میں کہا کہ بریف کیس وہیں رکھے گا۔ بڑی عورت بھی متوجہ ہوگئی۔ آدمی نے بریف کیس کھول کر بوتل اور گلاس نکالا اور غسل خانے کو چل پڑا۔

چھوٹی عورت نے آدمی کے لہجے کی درشتی کو نظرانداز کرتے ہوئے لاپروائی سے اپنے شانے اُچکائے۔۔۔۔

بڑی عورت نے آدمی کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اُسے وہ بےضرر لگا۔ اُس کے چہرے پر نقش گھبراہٹ کو لالٹین کی زرد روشنی نے اور گہرا کر دیا تھا۔ بڑی عورت نے سوچا، اگر آدمی نے اپنا گلاس بنایا تو وہ بو کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ اُس نے آدمی سے درخواست کی کہ وہ آج کی رات پینے سے اجتناب کرے کیونکہ بوتل سے نکلتی بو اُس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔

آدمی نے بڑی عورت کی بات سنی ان سنی کر دی اور دروازہ کھول کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ بڑی عورت نے اِس حرکت کو قابلِ نفرت سمجھا۔ اُس نے سوچا، شاید وہ اپنا نقطۂ نظر پوری طرح سے واضح نہیں کر سکی۔ چنانچہ اُس نے ملتجی نظروں سے چھوٹی عورت کی طرف دیکھا۔ چھوٹی عورت زرد روشنی میں بڑی عورت کے چہرے کی پریشانی کو قطعاً نہ سمجھ سکی۔ اُس نے اُس کی آواز سے ٹپکتی اُلجھن کو بوتل کے خلاف معاشرتی ردِعمل سمجھتے ہوئے بیگ میں سے پرفیوم نکال کر کمرے میں سپرے کر دیا۔ آدمی غسل خانے سے باہر آیا تو خوشبو کی بوچھار میں بھیگ گیا۔ اُسے اچھا لگا۔ اُس نے گلاس میں معمول سے زیادہ وھسکی انڈیلی۔ بڑی عورت نے نتھنے پھیلا کر ناگوار بو کو سونگھنے کی کوشش کی تو اُس کے پھیپھڑے مہکی ہوئی ہوا سے بھر گئے۔ چھوٹی عورت نے سانس کھینچنے کی آواز سن کر ایک دفعہ پھر پرفیوم کا سپرے کر دیا!

آدمی لمبا گھونٹ لینے کے بعد صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا!

آدمی نے پہلی دفعہ شام کے منظر کو اُس کے صحیح تناظر میں دیکھا۔۔۔ طوفانی بارش، معطر مگر ٹھنڈا کمرہ، تین چوتھائی بوتل اور دو خوبصورت عورتیں! لالٹین کی زرد روشنی میں اُسے یہ حالت ماورائی لگی۔۔۔ اُس نے ایک اور گہرا گھونٹ لیا تو کمرہ اُسے اور بھی پرکشش لگا!

بڑی عورت ابھی تک خائف تھی۔ وہ اپنے دماغ میں کئی سال سے بسی بو کو باہر نہیں نکال پائی تھی۔ اُسے وہ پہلی شام جب بھی یاد آتی تو لگتا کہ کسی بھی پل اُس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ فوراً تازہ ہوا میں سانس لینے چلی جاتی۔۔۔ لیکن۔۔۔ آج وہی بو ذہن کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس جاتی لہروں کی طرح دم توڑ رہی تھی۔ پرفیوم کی لطیف اور سکون بخش مہک اُس ناقابلِ برداشت بو پر غلبہ پا گئی تھی۔ بڑی عورت میں محسوس کیا کہ وہ اِس بُو سے واقف ہی نہیں تھی۔ پھر اُسے اپنے خاوند اور خود پر ترس آنے لگا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو شام اندھیرے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بارش نظر تو نہیں آ رہی تھی لیکن اُس کا شور اُسی طرح تھا۔ وہ پلنگ کے پاس آ گئی۔ اُس نے اچانک خود کو اپنی اُلجھن سے آزاد محسوس کیا اور بیگ سے اپنا پرفیوم نکال کر کمرے میں سپرے کر دیا۔ وہ یک دم اتنی پرسکون ہوگئی کہ اسے نیند آنے لگی۔۔۔

چھوٹی عورت کو کمرے کا منظر غیر حقیقی لگا۔ وہ تینوں اجنبی تھے اُسے معلوم تھا کہ لالٹین کی زرد روشنی اُن کے چہروں کے نقوش پر ایک غیر مرئی سا پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ وہ شاید صبح کی روشنی میں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں۔ اسے بڑی عورت کے رویے میں تبدیلی نظر آئی جس کے جسم کی زبان ایک دم تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ دوبارہ کھڑکی کے پاس چلی گئی مگر اَب اس کے گرد کسی الجھن کا گھیرا نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر کشیدگی کے بجائے سکون تھا۔ چھوٹی عورت حیران ہوئی کہ بڑی عورت خوبصورت تھی۔ اُسے لگا کہ زرد روشنی میں گھلتی ہوئی اُس کے چہرے کی ملائمت، کمرے کو مزید پراسرار بنا رہی ہے۔ چھوٹی عورت نے اس کے لیے اپنے اندر ایک معصوم سا لگاؤ محسوس کیا۔۔۔ آدمی اسے بےضرر لگا تھا۔ اب وہ دلچسپ بھی لگ رہا تھا۔ آدمی نے پہلا گلاس ختم کر کے دوسرا بنا لیا۔ اس دفعہ غسل خانے سے صوفے کی طرف آتے

ہوئے اُس میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ صوفے پر ایسے بیٹھا تھا جیسے کمرے میں اور کوئی موجود ہی نہ ہو۔ چھوٹی عورت نے محسوس کیا کہ کمرہ آدمی کی موجودگی سے مکمل اور محفوظ لگ رہا ہے۔۔۔ اس نے بڑی عورت کو پلنگ پر آنے کو کہا کیونکہ وہ شام سے کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔

آدمی کو دونوں عورتیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں۔ بڑی عورت میں اُسے پیچیدگی محسوس ہوئی جو شاید زندگی سے دست و گریباں ہوتے زیست کا حصہ بن گئی تھی۔ اُس کی نظریں کھڑکی، پلنگ اور صوفے تک بار بار ایک تکون بنا رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی اپنی زندگی بنجر زمین کے اُس ٹکڑے کی طرح ہے جسے کوئی بھی کاشت کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ وہ زرد روشنی میں بھی عورت کی آنکھوں میں ناکامی کی الجھن پڑھ سکتا تھا اُسے وہ اپنے جیسی مظلوم لگی۔ چھوٹی عورت اُس کے لیے معما تھی۔ آدمی اپنے تجربے سے محسوس کر سکتا تھا کہ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اُس کی خود اعتمادی سے قدرے چڑ گیا۔ وہ باہر کی بارش اور اندر کی ناقابل یقین حالت سے بے نیاز، پلنگ پر ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ آدمی کو یقین تھا کہ وہ دونوں اس کے لیے غیر اہم ہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ دونوں کی الجھن اور غیر یقینی حالت سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ آدمی کو یہ اچھا نہیں لگا..... اُسے چھوٹی عورت کی خود اعتمادی سے چڑ سی ہو گئی!

بڑی عورت پلنگ پر آ گئی اور لیٹتے ہی سو گئی۔

چھوٹی عورت پائینتی پر آدمی کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ تینوں ایک دوسرے کے ناموں سے ناآشنا ہیں اور کسی نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُس نے سوچا کہ نہ جاننا ہی بہتر ہے۔

باہر بارش کی شدت برقرار تھی!

آدمی نے بڑی عورت کی طرف ہمدردی سے دیکھا۔ پھر اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ اُس کی آواز سرگوشی سے ذرا بلند تھی۔ اُسے اپنے لہجے کی شدت پر تعجب ہوا۔ وہ پچھلے چوبیس برسوں سے جذبات سے ماورا لہجے میں میکانکی انداز میں گفتگو کرتا آیا تھا۔ آج اُس کے اندر کی گانٹھ آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑنا شروع ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دو چار فقروں میں بات ختم کر دے گا۔ ایسا نہ ہوا اور وہ اپنے اندر کے اندھیرے میں دبکے جذبوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگا۔ اُسے لگا کہ یہ جذبے تو دراصل چوروں کی طرح تھے جنہیں لفظوں کی گرفت میں لانا آسان نہ تھا مگر پھر وہ خود بخود الفاظ کے شکنجے میں آنے لگے۔ آدمی بولتا رہا اور کمرے میں اُس کے راز ہر سُو پھیلتے چلے گئے۔ بولتے بولتے جب وہ تھک گیا تو اُس کے اندر کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ بالکل خالی ہو گیا۔ اُسے لگا کہ کوئی اسے چھوئے تو وہ بج اُٹھے گا۔ وہ دو بڑے پیگ ختم کر چکا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ آج اُسے ایک اور کی ضرورت ہے اور وہ غسل خانے میں پانی لینے چلا گیا۔

بڑی عورت بے ہوش پڑی تھی!

چھوٹی عورت کو لگا کہ آدمی کا لہجہ چھوت کے جراثیم لیے ہوئے تھا۔ اُس کے پاس کہنے کو تو زیادہ نہیں تھا لیکن وہ بولے جا رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے تضادات تفصیل سے بتائے۔ ہل سٹیشن والے ہاسٹل کی زندگی کے تجربات بیان کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں جوانی کی روانی آ گئی۔ اُس نے بتایا کہ چھٹیوں سے واپسی پر اُس کی دوست گھروں سے بیئر کی بوتلیں لے آتی تھیں۔ وہ کل چھ تھیں اور تقریباً پچیس بوتلیں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں۔ وہ بیئر straws کے ساتھ پیتیں کیونکہ اُنہیں جھاگ کا ذائقہ پسند نہیں تھا اور پھر اتنے گلاس رکھنا بھی غیر محفوظ تھا۔ بڑی عورت کی طرح اُسے بو یا خوشبو کا مسئلہ نہیں۔ مدر سپیریئر کے ساتھ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ایک دفعہ بیئر کی بوتل کا ڈھکنا اُن تک پہنچ گیا۔ ڈھکنے کی موجودگی کا پتہ چلانے کے لیے بہت چھان بین ہوئی۔ جب تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو اُسے بلایا گیا۔ اُس نے پہلی اور آخری مرتبہ اُن کے سامنے جھوٹ بولا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔ کل اُس نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا ہے.....!

باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ آدمی گلاس تھامے اُٹھا اور سنبھل کر چلتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ چھوٹی عورت اُس کے پیچھے تھی۔ آدمی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ دستک دینے والا جا چکا تھا۔ بارش تھم گئی تھی۔ چاندنی سے دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر چھوٹی عورت اندر آ گئی۔ کمرے پر زرد روشنی کے اسرار کا اُسی طرح قبضہ تھا۔ اُس نے لالٹین بجھائی اور پردے کھول دیئے۔ بڑی عورت چاندنی میں نہا گئی۔ اُسے وہ اور بھی معصوم اور خوب صورت لگی۔

چھوٹی عورت باہر آدمی کے پاس چلی گئی۔

آدمی نے اُس کی طرف گلاس بڑھایا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ آدمی کو اُس کی ہنسی چاندنی کا حصہ لگی..... چھوٹی عورت نے کہا کہ اگلے سال یا شاید پھر اس سے بھی اگلے سال..... آدمی کی ہنسی دبی ہوئی تھی۔ پھر آدمی نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے ابھی تک نماز ادا نہیں کی۔

چھوٹی عورت نے ایک لمبا سانس لیا جیسے وہ چاندنی کو اپنے اندر کھینچ رہی ہو..... اور پھر اُس نے کہا کہ ابھی کافی وقت باقی ہے!

☆☆☆

طاہر نقوی

موڑ

گرجا گھر سے آنے والی اسٹریٹ جہاں بڑی سڑک سے ملتی تھی، سوزی وہیں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ اسٹریٹ کی طرف آنے والی گاڑیوں کو دیکھتی۔ پھر مایوسی سے اپنا سر جھٹکتی۔ اُسے وہاں کھڑے ہوئے اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ لہرا گئی۔ سامنے سے سلمان کی گاڑی آ رہی تھی۔ سوزی نے بڑھ کر اُسے رکنے کا اشارہ کیا تو گاڑی اُس کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔ سلمان ابھی اُس سے کچھ دریافت بھی کرنے نہ پایا تھا کہ دروازہ کھول کر وہ جلدی سے اُس کے برابر آ بیٹھی۔ سلمان اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

''میں جانتی ہوں۔ آفس جانے کے لیے تم یہی راستہ اختیار کرتے ہو۔''

''کیا تمہارے آفس کی گاڑی نکل گئی؟''

''یہی سمجھو۔'' سوزی معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''مجھے تو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ میں تمہیں ڈراپ نہیں کر سکتا۔''

''آج تم آفس نہیں جاؤ گے۔'' سوزی نے بڑی مان سے کہا۔

''کیوں؟''

جواب دینے کے بجائے سوزی نے اُسے نشیلی نظروں سے دیکھا۔ اُس پر نہ جانے کیوں مدہوشی چھانے لگی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سلمان کی معیت میں اُس پر اکثر یہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت سلمان کو آفس جانے کی جلدی معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے اُس کے چہرے پر ہلکی سی بیزاری کا تاثر تھا۔ اُس نے پوچھا:

''یہ تمہیں کیا ہوا؟''

''اچانک نہیں ہوا۔'' سوزی نے اٹھلا کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ سوچ کر ہی تمہیں آمادہ کر رہی ہوں۔''

سلمان کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ شاید سوزی کو بھی اپنے اوپر اعتماد تھا۔ اُس نے سلمان کو خوشامدانہ انداز میں دیکھا اور اپنی بانہیں اُس کے گلے میں حمائل کر دیں۔ اب حسب توقع سلمان پسیج چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور آمادہ ہوتے ہوئے نرمی سے مسکرایا۔ سوزی نے اُسے اپنے گھر

چلنے کو کہا تو سلمان نے پوچھا۔

''تمہارا شوہر.....''

''آج وہ جان بوجھ کر آفس نہیں گیا۔''

''پھر تم مجھے اپنے گھر کیوں.....''

اب سوزی لگاوٹ سے مسکرائی۔

''وہ صبح سویرے کسی کام سے کہیں چلا گیا۔ اب رات گئے واپس آئے گا۔''

سوزی نے ایک موقع پر سچ کہا تھا۔ عورت آمادہ ہو تو مرد اپنے سارے کام بھول بیٹھتا ہے اور یہی ہوا۔ سلمان نے آفس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور گاڑی کا رُخ سوزی کے گھر کی جانب کر دیا۔

سلمان اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ آیا تو پہلے پہل یونیورسٹی میں اُس کی ملاقات سوزی سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ اس دوستی نے سوزی کے دل میں محبت کا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ جذباتی لڑکی تھی۔ اُس کی محبت میں ہر لمحے بے قراری رہتی تھی۔ اس کے برعکس سلمان ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح تھا۔ اگرچہ اُسے بھی سوزی سے شادی پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر غیر متوقع طور پر حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ اُن دونوں کی شادی نہ ہو سکی۔ انسان حالات کے دھارے کے ساتھ بہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چنانچہ سلمان کو اپنے خاندان میں شادی کرنی پڑی۔ یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ وہ دونوں اُسی طرح ملتے جلتے رہے۔ سوزی ہر لمحے سلمان کی محبت میں شرابور رہتی۔ وہ اُس کی شخصیت سے متاثر تھی۔ اس لیے وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اُس کا شوہر اپنی بزنس بڑھانے کے چکر میں محض پیسہ بنانے کی مشین بن کر رہ گیا تھا۔ رات گئے وہ واپس آتا تو تھکن کے باعث بستر پر پڑتے ہی سو رہتا۔ کبھی اُس کی طبیعت اس طرف مائل ہوتی تو سوزی مزاحمت نہ کرتی بلکہ کسی روبوٹ کی مانند اُس کی مرضی پر چلتی رہتی۔ البتہ اپنے شوہر کے ساتھ اس عمل کے دوران اُس کے ذہن میں سلمان پورا کا پورا موجود رہتا۔ یوں اُس کے دل میں ہمیشہ ایک خلش سی باقی رہتی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ مغربی مرد پھیکے پھیکے ہوتے ہیں۔

سوزی کے گھر میں کافی پیتے ہوئے دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ مگر سوزی کے من میں ہلکی ہلکی آگ سلگ رہی تھی۔ وہ اس آگ کو اب بجھانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اپنے اندر اُٹھتے ہوئے طوفان کی وجہ سے اُس نے اپنے وجود کو سلمان کے سپرد کر دیا۔ اسی اثناء میں سلمان کے موبائل فون کی گھنٹی چیخی۔ دوسری طرف اُس کی بیوی تھی۔ اُس کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ نمایاں تھی۔

''سلمان تم ٹھیک تو ہو نا۔''

''ہاں''

''اِس وقت کہاں ہو؟''

''آفس میں بیٹھا کام کر رہا ہوں۔'' یہ سن کر اُس کی بیوی نے اطمینان کا سانس لیا۔ سلمان

نے سوال کیا۔

''مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کیا تمہیں ابھی تک کچھ نہیں معلوم؟''

''نہیں''

پھر دوسری طرف کی بات سن کر سلمان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اوہ مائی گاڈ''

بات ختم کر کے اُس نے موبائل فون بند کرتے ہوئے پریشانی کے عالم میں سوزی کو دیکھا۔

''کس کا فون تھا؟''

''عائشہ کا''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''ٹریڈ ٹاور دہشت گردی کا نشانہ بن گیا۔''

اس سانحے کی خبر سن کر سلمان دہشت زدہ رہ گیا تھا۔ سوزی نے بڑھ کر ٹی وی آن کیا تو اس وقت ٹریڈ ٹاور کی تباہی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ سوزی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اگر تم آفس چلے جاتے تو.....''

سلمان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ خودکار اسپرنگ کی مانند اُٹھا اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

سلمان کو دیکھتے ہی عائشہ اُس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ سلمان فوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ عائشہ باہمی اعتماد کا ٹاور گرنے سے رو رہی ہے یا مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے ٹریڈ ٹاور کے تباہ ہونے کی وجہ سے۔ وہ چند ثانیے ساکت کھڑا رہا۔ جب یہ طوفان ذرا سا تھما تو دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔

''ایسا کیوں ہوا؟''

''کس نے کیا؟''

''یا جان بوجھ کر ایسا کیا گیا؟''

ان سوالوں کا جواب اُن کے پاس نہ تھا اور شاید کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

اب سلمان اور عائشہ کہیں ساتھ ساتھ نکلتے تو اُنہیں ماحول میں کوئی تبدیلی محسوس ہوتی۔ یہ تبدیلی اُن کے آس پڑوس میں بسنے والوں اور راہ گیروں کے چہروں سے نمایاں نظر آتی۔ انہیں اجنبیت کی اس فضا میں سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ طویل مدت بسر کرنے کے باوجود وہ اس سرزمین پر ایک بار پھر اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ اُس سانحے کے بعد حالات کی گرد ذرا بیٹھی تو سلمان اپنے آفس گیا۔ وہاں ہر جانب سے اُس پر حقارت آمیز نگاہ پڑ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان نظروں کا مقابلہ کیسے

کرے۔ تاہم وہ خاموشی سے جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُسی وقت ایک ملازم نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ سلمان نے اُسے کھولا تو اُس کے ذہن میں دھماکہ ہوا۔ وہ ملازمت سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اُس نے سٹ پٹا کر اُس ملازم کو دیکھا۔ وہ تضحیک آمیز انداز میں ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس رویے پر سلمان تلملا کر رہ گیا۔ وہ شدید غصے کے عالم میں اپنے متعلقہ آفیسر کے کمرے میں جا پہنچا۔ اُس نے سلمان کی کوئی بات سننے اور کسی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ نفرت سے کہا۔

''تم ہی نہیں۔ تمہارے جیسے دیگر ملازمین کو بھی نکال دیا گیا ہے۔''

''آخر کیوں؟''

''دہشت گردی۔''

یہ سن کر سلمان کا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ تاہم اُس نے یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ آفس کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مڑ کر ٹریڈ ٹاور پر الوداعی نظر ڈالی۔ اب وہ پرندے نظر نہیں آئے جو وہاں ہر وقت بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے بجائے وہاں سے مسلسل کثیف دھواں اُٹھ رہا تھا اور ماحول کے ساتھ ذہنوں کو آلودہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر وزیر آغا

''شیشے کے کنول''۔۔پس منظر

وہ لوگ جنھوں نے جدید اُردو شاعری کا مطالعہ کیا ہے، میری اس گزارش سے شاید اتفاق کریں کہ اس میں آغازِ کار ہی سے شہر اور اس کی مشینی شیرازہ بندی کے خلاف ایک شدید ردِعمل ملتا ہے، رِکر کے گور نے کہا تھا کہ ضابطے اور سسٹم کی فضا میں میری ذات کی نفی ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ''میں'' ہوں، ریاضی کی کوئی علامت نہیں ہوں۔ کچھ اسی انداز میں جدید اُردو شعراء نے بھی سوچا ہے جب اُن کے سامنے شہر کا وہ میکانکی اور اشتراکی روپ اُبھرا ہے جو فرد کی انفرادیت کو ختم کر کے اسے محض مشین کا ایک پرزہ بنا دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ان شعراء نے ہزار ٹانگوں والے اس کیکڑے یعنی شہر اور اس کے منضبط نظام سے پناہ مانگی ہے۔ گو وہ اس کے زیرِ سایہ زندگی گزارتے چلے گئے ہیں تاہم کم از کم اپنے شعروں میں اُنہوں نے اُس کھلی ہوا اور وسعت کا بار بار ذکر ضرور کیا ہے جو اَب انہیں حاصل نہیں اور جس کی بھرپور نمائندگی جنگل اور دیہات کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جب شہر وسیع ہونے لگے تھے تو بعض عالی مرتبت لوگ کھلے بندوں ان پر لعنتیں بھیجنا شروع ہو گئے تھے بلکہ ان کی بوجھل، متعفن اور منجمد فضا سے ہجرت کر جانے پر بھی آمادہ تھے۔ جدید اُردو شعراء کے ہاں اگر انفرادیت کے تحفظ کا میلان اُبھرا ہے اور اُنہوں نے اک آزاد اور کھلی فضا کو لوٹ جانے کی آرزو کی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اُن عالی مرتبت لوگوں کے دکھائے ہوئے راستے پر ہی گامزن ہوئے ہیں۔

شکل و صورت کے اعتبار سے ہر شہر شہد کے چھتے کے مماثل ہے اور اس لیے زود یا بدیر چھتے کے اس نظام کو اپنا لیتا ہے جس میں ''ملکہ'' مطلق العنان ہوتی ہے اور بعض اوقات ایک جمہوری نظام کے تابع! تاہم دونوں صورتوں میں شہر ایک ایسے اجتماعی اشتراکی روپ ہی کا مظہر ثابت ہوتا ہے جس میں فرد سماج کا تابع مہمل ہوتا ہے۔ دوسری طرف دیہاتی زندگی میں فرد زمین و آسمان کی بے کنار وسعتوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور ایک پرندے کی طرح دن بھر دانہ دنکا چگنے کے بعد شام سمے اپنے رین بسیرے کو لوٹتا ہے۔ لہٰذا اس کے ہاں کسی مشینی ماحول کے تابع ہونے کے بجائے گرد و پیش سے منسلک ہونے کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ شاعر بنیادی طور پر آزادیٔ اظہار کا رسیا اور انفرادیت پسند ہے لہٰذا وہ شہر کے در و دیوار میں مقید ہونے کے بجائے کھلی فضا میں نکل آنے پر فطرتاً مائل ہوتا ہے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ سنگلاخ دیواروں والے شہر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے تو اپنے اشعار میں ''آزادی'' حاصل کرنے کی آرزو کا برملا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ صورتِ حال اُن ایام میں بطورِ خاص اُبھرتی ہے جب دیہات سے

شہروں کی طرف آبادی کا انتقال بڑے پیمانے پر شروع ہو جاتا ہے، ہمارے ہاں پچھلے تیس پینتیس سالوں میں گاؤں سے شہر کی طرف لوگوں کی یورش نے ایک ایسی نئی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہزارہا برس تک کھلی فضا میں رہنے والا فرد اب یکا یک ایک پنجرے میں قید ہو گیا ہے اور باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہ پا کر بے اختیار سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے لگا ہے۔ اُردو شاعری میں دیہاتی اور شہری زندگیوں کے تصادم کا جو ذکر بار بار ملتا ہے، اس کی اصل وجہ یہی ہے۔

خاور اعجاز کے مجموعۂ کلام کو اس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے مگر اس سے پہلے کہ میں ایسا کروں مجھے بعض رسمی باتوں کے اظہار کی اجازت دیجیے مثلاً خاور اعجاز کے ہاں تصورات کی تازگی اور اظہار کی ندرت نمایاں ہے۔ ان کے اس وضع کے اشعار

جدید دَور نے مصلوب اس طرح سے کیا   کہ جسم چھلنی ہوئے روشنی کے کیلوں سے
سب نے راہوں میں چن دیئے تارے   چاند اُترے تو اب کہاں اُترے
ہر ایک سنگ میں پتھر کا دل نہیں ہوتا   کبھی کسی کو اُٹھا کر گلے لگا تو سہی
دیوار پھر لحاظ سے سَر پر کھڑی رہی   چپکے سے مجھ پہ سایۂ دیوار آ پڑا
یوں رُک گئے ہیں لوگ سفر کے خیال سے   رستے میں جیسے کانچ کا بازار آ پڑا

اُن کے روشن مستقبل کے غماز ہیں۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد مجھے خیال کے دھاگے کو وہیں سے پکڑنا ہے جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا تاکہ میں یہ کہہ سکوں کہ خاور اعجاز کے اشعار میں وہی رو بڑے حسین انداز میں اُبھر آئی ہے جو آج کے اچھے اُردو شعراء میں ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے یعنی دیواروں، گلیوں اور کھڑکیوں سے مرتب شدہ زندان یعنی شہر کی سماجی شیرازہ بندی سے فرد کو بچانے کی کوشش۔ اس سلسلے میں اُن کے یہ چند شعر قابل ذکر ہیں۔

کچھ تو لحاظ آئے گا بے مہر شہر کو   لکھ دو فصیلِ شہر پہ گاؤں کے تبصرے
چشمِ خیال صورتِ رفتہ کہیں سے ڈھونڈ   شیشوں کے شہر میں کوئی اپنا کہیں سے ڈھونڈ
اس شہر میں عبث ہے وفاؤں کی جستجو   یہ شہر تو بدلتا ہے رائے ہوا کے ساتھ
ہر ایک فرد کی آزادیوں کو سلب نہ کر   امیرِ شہر ذرا اپنے اختیار سمیٹ
ابھی تو گاؤں کی مٹی یہاں نہیں پہنچی   ابھی تو شہر سے اُٹھتا ہوا غبار سمیٹ
شہر سارا اگر ہے خشک تو پھر   ابر کن کے گھروں پہ برسا تھا
آنکھوں میں رتجگوں کا دھواں اُڑ رہا ہے یوں   گویا کہ ہم گھروں میں نہیں مورچوں میں ہیں
ہم نے توقعات سے بڑھ کر دیا خلوص   لیکن ہمیں تو پھر بھی نہیں راس آئے شہر
بہتے ہوئے لہو نے فصیلوں پہ پھیل کر   اک وارداتِ شہر کا عنواں بنا دیا
تمام چہروں پہ رقمیں دکھائی دیتی ہیں   تمام شہر ہے سستے کباڑیوں جیسا

مرا معاشرہ بوسیدہ فائلوں کی طرح ہر ایک فرد ہے جس میں دبا ہوا کاغذ

اُن کے مجموعۂ کلام میں شہری زندگی کے بارے میں اس وضع کے لاتعداد اشعار ملتے ہیں جو اُن کے نفسیاتی ردِعمل کو سامنے لاتے ہیں۔ ان اشعار سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اُنہوں نے شہر کو یارِ غار نہیں بلکہ مدِ مقابل کے روپ میں دیکھا ہے اور مدِ مقابل بھی ایسا کہ ہر لحظہ شاعر کا گلا گھونٹنے پر مستعد دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کو یہ شہر وفا اور خلوص سے تہی ایک بالکل کاروباری مزاج کا حامل نظر آیا ہے۔ وہ ایک سستے کباڑیئے کی طرح ہے یا پھر بوسیدہ فائلوں کا ایسا انبار ہے جس میں فرد ایک فرسودہ کاغذ کی طرح دب گیا ہے۔ شہری زندگی میں فرد اور معاشرے کا یہ تصادم جس میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل ڈٹ گئے ہوں، خاور کے علاوہ دوسرے جدید شعرا کا بھی موضوع ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شہر نے زندگی کو ناظر Subject اور منظور Object میں تقسیم کر کے وہی صورت پیدا کر دی ہے جو ڈیکارٹ کو نظر آئی تھی۔ اس سے جدائی اور بُعد Alienation کی وہ فضا پیدا ہوئی ہے جسے ایک ''معاشرتی المیہ'' کا نام دینا چاہیے یعنی جس میں فرد کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ معاشرے کا مشینی نظام اُسے ہڑپ کر جانے کے درپے ہے اور معاشرہ یہ محسوس کرتا ہے کہ فرد اُس سے بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہے۔ اُردو کے جدید شعرا نے دوئی کی اس فضا کو بُری طرح محسوس کیا ہے اور خاور کے ہاں بھی اِس کا اظہار جا بجا ملتا ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ اُردو کے جدید شعراء نے بُعد کی اس فضا کو محض ایک بے بس ناظر کی طرح دیکھتے چلے جانے یا مغربی ادب کے آؤٹ سائیڈر کی طرح آسمان کی طرف منہ کر کے تہدیدی انداز میں مکے کو ہوا میں لہرانے کے بجائے اُس فضا میں لوٹ جانے کی آرزو کی ہے جو وجودیت کی اصطلاح Being in the World کے عین مطابق ہے یعنی جس میں رہتے ہوئے فرد ماحول سے خود کو جدا محسوس نہیں کرتا۔ ہائیڈگر نے اِس قسم کے ''جڑے ہوئے فرد'' کے بارے میں To Dwell کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی لمحے ایسا شخص اپنے ماحول سے پوری طرح منسلک اور مربوط ہوتا ہے۔ وہ ماچس میں بند ایک تیلی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں ہو اور گھر کے افراد ہی نہیں اس کے در و دیوار سے بھی ایک اہم رشتہ میں منسلک ہو۔ ہمارے معاشرے میں شہر بالخصوص ایک بڑا شہر تو بُعد کی فضا کو اُبھار رہا ہے مگر ہمارا دیہاتی معاشرہ تا حال فرد سے متصادم نہیں ہوا اور وہاں کا فرد محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے مربوط اور منسلک ہے۔ ایسی صورت میں جدید اُردو شعرا کا یہ رویہ کہ وہ دیہاتی اکائی کی فضا کو شہر میں پیدا ہونے والی دوئی پر ترجیح دے رہے ہیں، ہر اعتبار سے ایک صحت مند رویہ ہے۔ خاور اعجاز نے خود کو خیال کی اِس موج میں شامل کر کے ایک ایسا قدم اُٹھایا ہے جس نے اُنہیں جدید اُردو شاعری کے ہراول دستے میں جگہ دلا دی ہے۔

☆☆☆

آسیہ اشرف

شوکت نعیم قادری کی تصنیف 'نتائجِ فکر' ایک تجزیہ

'نتائجِ فکر' شوکت نعیم قادری کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب شعبۂ اردو بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان نے جون ۲۰۰۴ء میں شائع کی۔ کتاب کا انتساب، والدہ ماجدہ بیگم ایس۔ قادری اور برادرِ بزرگ یوسف سلیم قادری کے نام ہے۔ انتساب میں یہ شعر بھی درج ہے۔

جن کی ہے وہ مثال کہ جیسے کوئی درخت
اوروں کو چھاؤں بخش کے خود دھوپ میں جلے

'چند اَن کہی' باتوں کے عنوان سے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِن مضامین کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

'' 'نتائجِ فکر' میرے تنقیدی اور تحقیقی مقالات (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) پر مشتمل اوّلین مجموعہ ہے۔ یہ تمام مقالات مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے اور ملتان آرٹس فورم، ملتان کی تنقیدی نشستوں میں پڑھے گئے۔ بعد ازاں اِن میں سے چند مختلف ادبی جرائد میں طبع بھی ہوئے۔''

اِس کتاب میں کل ۱۶ مضامین شامل ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں ہے:

۱۔ بابائے اردو کی حمایت میں ('ہندو ضمیات' پر عرش صدیقی کے دیباچے کے حوالے سے چند باتیں)
۲۔ لفظ 'ہندوستان' کی ماہیت
۳۔ لفظ 'خرافات' - ایک تحقیق
۴۔ لفظ 'سرائیکی' پر ایک نظر
۵۔ ملتان کے حوالے سے ایک اردو تلمیح
۶۔ راشد کی میّت سوزی کی وصیّت - چند حقائق
۷۔ راشد کی نظم 'تصوف' پر ایک نظر
۸۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ 'آوارہ گرد' - ایک تاثر
۹۔ مشرق کا رڈولف ویلنٹینو - شیخ افتخار رسول

('گردشِ رنگِ چمن' میں مذکور ملتان کے شیخ افتخار رسول کے حوالے سے چند باتیں)

۱۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ناول
۱۱۔ فیض احمد فیض کا ایک شعر
۱۲۔ عبیداللہ علیم کی وطن دوستی - ایک نئی جہت
۱۳۔ ڈاکٹر انوار احمد - روشن آنکھوں والا کہانی نگار
۱۴۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (عرش صدیقی کے افسانے 'باہر کفن سے پاؤں' پر ایک نظر)
۱۵۔ آخری خواہش کی تعمیل میں
(عرش صدیقی کا پسندیدہ افسانہ 'مور کے پاؤں' ایک تجزیہ)
۱۶۔ کیا دو انبیاء کرام کے اجسادِ مبارک کو حنوط کیا گیا؟

تجسّس کا مادہ انسان میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہی تجسّس انسان کو نئی سے نئی دنیا تلاش کرنے میں مشغول رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کی ماہیت جاننا چاہتا ہے اور ذہن میں اُبھرنے والے ہر سوال کا جواب چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اظہارِ ذات کا جذبہ بھی اُسے ہمہ وقت بے چین رکھتا ہے۔ شوکت نعیم قادری کو بھی انہی دو فطری جبلتوں نے تحقیق کی طرف مائل کیا یعنی اظہارِ ذات کا جذبہ اور تجسّس۔ وہ کتاب کے 'پیش لفظ' میں رقم طراز ہیں:

''یہاں ایک سوال اُبھرتا ہے کہ آخر میں کیوں لکھتا ہوں؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہی ہے کہ لکھنا ذریعۂ اظہارِ ذات سے اور اظہارِ ذات بنیادی طور پر صفتِ الٰہی ہے۔ یہی صفت ایک کیفیت بھی ہے جو ہر خلّاق کے رگ و پے میں موج زَن ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی سوال میرے پیشِ نظر ہوتا ہے اور میں اُس سے متعلق واضح ہونا چاہتا ہوں تو مختلف زاویوں سے اُس کا مطالعہ کرتا ہوں اور پھر اپنے مطالعے کے نتائج کو سپردِ قلم کر دیتا ہوں۔''

مزید یہ کہ وہ اپنے نتائجِ فکر کو دوسروں تک بھی پہنچانا چاہتے ہیں اور یہی بات اِس کتاب کی اشاعت کا سبب بنتی ہے۔ شوکت نعیم قادری کی ذات کا ایک خوب صورت پہلو یہ ہے کہ جب کوئی بات اُنہیں Pinch کرتی ہے تو وہ اُس کی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں وہ اختلاف کا حق ہمہ وقت اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں مگر یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اختلاف، اختلافِ برائے اختلاف ہے۔ ان کے ہاں یہ روّیہ صحت مندانہ قدر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ وہی اختلاف ہے جو انسان کو احتجاج پر آمادہ کرتا ہے اور اُس بات کی اصل جاننا چاہتا ہے جس پر اُسے اختلاف ہے۔ اِس بات کا اظہار شوکت نعیم قادری اِس کتاب میں شامل پہلے ہی مضمون 'بابائے اردو کی حمایت میں' کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اُن کی تقریباً تمام تصانیف ہی میری نظر سے گزری ہیں مگر ان کی ایک تحریر پڑھ کر میں بے اختیار ٹھٹکا اور چونکا پھر اس کے چند نکات نے مجھے دعوتِ فکر

دی۔''

مصنف کا پہلا مضمون پڑھتے ہی اس کی تخلیقی اُپج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ وہ عرش صدیقی کے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت اور کام کے حوالے سے اعتراضات سے متعلق ہے۔ عرش صدیقی نے مولوی عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے Myth کا ترجمہ خرافات کیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے بابائے اردو کو کٹھ ملا تصور کیا ہے۔ شوکت قادری نے کیے گئے تمام اعتراضات کے شافی جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے Myth کے مولوی عبدالحق کے بیان کردہ معانی 'خُرافات' کے حق میں دلائل کے لیے کئی لُغات سے استفادہ کیا ہے جن میں Dr. S.W. Fallon کی English Urdu Dictionary اور F. Steingass Ph.D. کی لغت A Comprehensive Persion English Dictionary شامل ہیں۔ ان کے دیے گئے دلائل انتہائی منطقی اور قابلِ قبول ہیں۔ اُنہوں نے مولوی عبدالحق کی تالیف شدہ لغت 'سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری' کے ضمن میں کی گئی کوششوں کا بھی مفصّل ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے لفظ Myth اور اس کا کیا گیا ترجمہ خُرافات دونوں کے لُغوی مفہوم کا بھی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ڈاکٹر آرزو چودھری کی کتاب 'دیو مالائی جہان' سے حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اپنے اِس مقالے میں اُنہوں نے جن کُتب سے استفادہ کیا ہے آخر میں حوالہ جات کی سُرخی کے تحت اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔ 'نتائجِ فکر' کا اگلا مضمون ہے 'لفظ 'ہندوستان' کی ماہیت۔ شوکت قادری نے اپنے اس مختصر مضمون میں لفظ ہندوستان اور اس کی نوعیت کو موضوعِ بحث بنانے کے ساتھ ساتھ اُن اسباب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ جو اِس نام کی وجہ تسمیہ بنے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مصنف نے اردو لغت، فرہنگِ آصفیہ، فیروز اللغات، نور اللغات، ہندی اردو لغت جیسی مستند لغات سے استفادہ کیا ہے۔ بایں ہمہ اُنہوں نے مختلف کتب جن میں 'قاموس الکتاب، ہندوستان اور اردو کیسے لکھیں؟' کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ لفظ ہندوستان کے مختلف مفاہیم اور وجہ تسمیہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہندوستان کا مطلب ہے دریاؤں کی سرزمین اور اس کا ذکر کہیں بھی کسی مخصوص عقیدے کے حامل لوگوں کے مسکن کے طور پر نہیں آیا۔

لفظ 'ہندوستان' کے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پسِ منظر اور وجہ تسمیہ کا مفصّل جائزہ لینے کے بعد مصنف نے لفظ 'خُرافات' اور لفظ 'سرائیکی' پر بھی بہت وقیع تحقیق کی ہے۔ اپنے مضمون 'لفظ 'خُرافات ___ ایک تحقیق' کے آغاز میں علمِ اشتقاق کا ذکر کرنے کے بعد اس لفظ کے لُغوی اور حقیقی معانی کا جائزہ لیا ہے۔ اس حوالے سے اُنہوں نے مولوی عبدالحق کی لُغت اور پروفیسر عرش صدیقی کی تحریر کا بھی ذکر کیا ہے۔ فاضل مصنف نے لفظ 'خُرافات' کا پس منظر اور معانی کے بیان میں چند احادیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ احادیث علمِ حدیث سے متعلق مستند کتب سے لی گئی ہیں جن میں مسندِ امام احمد بن حنبلی تو زیع،

جامع ترمذی شریف اور سیرت عائشہؓ تالیف علامہ سید سلیمان ندوی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اُنہوں نے بہت سی لغات سے بھی استفادہ کیا ہے جن کی طویل فہرست مضمون کے آخر میں دی گئی ہے۔ اِن تمام حوالہ جات اور لُغات نے اِس مضمون کو بہت منطقی اور پُر اثر بنا دیا ہے۔ کتاب کا اگلا مضمون 'لفظ 'سرائیکی' پر ایک نظر' ہے۔ سرائیکی پاکستان کے جنوبی گوشوں میں بولی جانے والی ایک بڑی اور اہم زبان ہے۔ شوکت قادری نے اپنی اِس مختصر تحریر میں اس لفظ 'سرائیکی' کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اُنہوں نے اپنے اِس مضمون میں لفظ ''سرائیکی'' کے اشتقاقی پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بعد ازاں وہ اس زبان کے مختلف ناموں اور اس کے تجویز کردہ نام 'سرائیکی' کے بارے میں بھی بہت سی وقیع معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لفظ 'سرائیکی' کی نوعیت اور پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے چند ماہرین کے نظریات کا حوالہ دیا ہے جن میں Sir George Abraham Grierson جن کی کتاب "Linguistic Survey of India"، پروفیسر علی عباس جلال پوری کی تصنیف 'خرد نامہ جلال پوری' یحییٰ امجد کی کتاب 'تاریخ پاکستان (وسطی عہد)'، سید نور علی ضامن حسینی کی تصنیف 'معارفِ سرائیکی' اور جرمن پروفیسر آردان راتھ شامل ہیں۔ مصنف کا یہ مضمون بھی انتہائی دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔

کتاب کا اگلا مضمون بھی انتہائی دل چسپ ہے 'ملتان کے حوالے سے ایک اردو تلمیح'۔ اپنے اِس مضمون میں مصنف نے تلمیح کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ تلمیح کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یہ تلمیحی محاورہ یوں ہے:

''وہ پانی ملتان گیا، وہ پانی ملتان بہہ گیا، وہ پانی ملتان آ گیا۔ جس کے معانی یہ ہیں: اب موقع جاتا رہا، وہ بات گئی گزری ہوئی یا ہوگئی۔ وہ بات جاتی رہی، وہ بات اب کوسوں گئی، رات گئی بات گئی، وہ بات ہی نہ رہی۔''

ان تمام وضاحتوں کے بعد وہ اِس تلمیح کا پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اِس پس منظر کے بیان کے لیے اُن کے سامنے تین ماخذات ہیں خزانۂ تلمیحات از محمود نیازی، بھگت کبیر، حیات و تعلیمات از ڈاکٹر عبدالحفیظ اور فرہنگِ آصفیہ۔ پس منظر انتہائی دل چسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ مضمون کے آخر میں مصنف شیخ محمد ابراہیم ذوق کے ایک شعر کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں اس تلمیحی محاورے کو برتا گیا ہے۔ شعر دیکھیے:

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حُسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

کتاب کا چھٹا مضمون راشد کی 'میت سوزی کی وصیت- چند حقائق' ہے۔ ن م راشد کا نام آزاد نظم کے پہل کاروں میں شامل ہے۔ اپنے اِس مضمون میں شوکت قادری نے راشد کی میّت سوزی

کی وصیّت کے متعلق حقائق کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اِس تحقیق کا محرک وہ خود اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اب یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا راشد اور قارئین راشد کے درمیان موجود بُعد یا ابعاد کے ضمن میں صرف اور صرف ان کے مشکل پسندی ہی آڑے آتی ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں بل کہ اس کے پس منظر میں ایک اور اہم وجہ بھی کارفرما ہے وہ راشد کی میت سوزی کی وصیت۔ جیسے ہی راشد کے قاری کے علم میں یہ وصیت آتی ہے تو وہ چونک اُٹھتا ہے اور کچھ خدشات اور تعصّبات از خود اس کے من میں جگہ پا جاتے ہیں۔''

اِس کتاب کا اگلا مضمون بھی راشد کے متعلق ہی ہے۔ اس کا عنوان ہے 'راشد کی نظم 'تصوف' پر ایک نظر' ہے۔ اس میں راشد نے تصوف کے خرابوں کا ذکر کیا ہے اور مصنف نے اِس نظم میں موجود تصورات کی بہت خوب صورتی سے وضاحت کرنے کے ساتھ برِصغیر میں متصوفانہ رُجحان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُنہوں نے اقبال کے نظریۂ تصوف پر بھی بحث کی ہے۔

مصنف کا خوب صورت انداز دیکھیے:

''نظم کے تیسرے حصے میں راشد کہتے ہیں کہ ہم 'تصوف' کے پوشیدہ ثمرات اور اثرات ہی کو 'نشانِ سرِ منزل' سمجھتے ہیں اور اسی پر خوش ہو لیتے ہیں۔ وگرنہ ہماری یہ نام نہاد کامیابی، کامیابی نہیں بل کہ 'پامالی کا افسانہ' ہے۔ 'پامالی کے افسانے' کے تناظر میں ہم خانقاہی نظام سے منسلک استحصالی ٹولے اور اس کے شکار سادہ لوح افراد کے افعال و کردار کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

راشد کی نظم کے جائزے کے بعد شوکت نعیم قادری نے 'قرۃ العین حیدر کا افسانہ 'آوارہ گرد' -ایک تاثر' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِس میں مصنف کہانی کا پس منظر بیان کرتا ہے اور اِسی کہانی کے موضوع کے حوالے سے ایک معروف جرمن نوبل انعام یافتہ دانش ور اور ناول نگار برمن ہیسس کی نثری اور شعری تصنیف wandering کا بھی ذکر کیا ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر انور زاہدی نے 'بارشوں کا موسم' کا نام سے کیا ہے۔ جس سے مصنف کے وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کا نواں مضمون 'مشرق کا رڈولف ویلنٹینو- شیخ افتخار رسول' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے حوالے سے جو بات انتہائی دل چسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ شیخ افتخار رسول کی شخصیت ہمارے لیے کسی قدر اجنبی ہے۔ یہ نام پہلی بار مصنف کی نظر سے قرۃ العین کے ناول 'گردشِ رنگِ چمن' کے مطالعے کے دوران گزرا اور اس نام نے مصنف کی توجہ کو اپنی جانب کھینچا۔ ناول میں شیخ افتخار رسول کا نام پڑھ کر مصنف کو اُن کے متعلق جاننے کی خواہش ہوئی۔ اس کے لیے انہوں نے ممتاز مصور، ادیب اور

دانش ور زّوار حسین سے معلومات حاصل کیں اور اُن کے رشتہ داروں سے بھی ملاقات کی۔ اپنے اس مضمون میں مصنف شیخ افتخار رسول کا شجرۂ نسب بھی تفصیلاً بتاتا ہے۔ دی گئی معلومات سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ شیخ افتخار رسول ولایت میں فلم کے شعبے سے منسلک رہے۔ اُنہوں نے رقص، اداکاری، ہدایت کاری اور فلم سازی میں مہارت حاصل کر کے بہت سی خاموش فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے وہاں معروف مزاحیہ اداکار سر چارلی چیپلن ان کا رفیقِ کار اور رُوم میٹ رہا۔ مشرق کا رڈولف ویلنٹینو کا خطاب بھی اُنہیں ہالی وڈ میں ہی دیا گیا۔ آخر میں مصنف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے اِس موضوع پر تحقیق کے نئے دروازے وا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''اِس مختصر مضمون میں شیخ افتخار رسول کے حوالے سے ابتدائی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی شخصیت اتنی جان دار تھی کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے مزید کام کرنے کی گنجایش ہے۔''

کتاب کا اگلا مضمون بھی مصنف کے ذوقِ تحقیق اور تجسّس کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون ہے 'ڈاکٹر سید عبداللہ اور ناول'۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ فاضل مصنف میں تجسّس کا مادہ اور بہ درجہ اُتم موجود ہے اور ہر وہ چیز اور بات جسے وہ حقیقت کے خلاف جانتے ہیں اُس پر قلم اُٹھانے کو تیار سمجھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بے دار رکھتے ہیں۔ یہ عمل بہت تخلیقی جرأت کا متقاضی ہے اور شوکت قادری اس کے تقاضوں کو بھرپور طریقے سے نبھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں بھی وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی معروف کتاب ''اشاراتِ تنقید'' کے آخر میں دیئے گئے ضمیمے کا ذکر کرتے ہیں۔ ضمیمے کا عنوان ہے ''قلم کے چراغ''۔ اس ضمیمے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ناول کے بارے میں اپنے ایسے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے جو خلافِ حقیقت ہیں۔ مصنف نے اِس مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیالات بھی بیان کیے ہیں اور ایک ادیبانہ صنف ہونے کی حیثیت سے ناول کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ یہ مخالفت برائے مخالفت نہیں بل کہ اُن کے تاثر کا ایک ردِعمل ہے۔ شوکت نعیم قادری کا اگلا مضمون عظیم شاعر فیض احمد فیض کے ایک شعر سے متعلق ہے۔ شعر کچھ یوں ہے:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے ، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

اُنہوں نے اِس شعر کے پس منظر اور تمام معنوی پہلوؤں پر سیرِ حال بحث کی ہے۔ آخر میں وہ اقبال اور غالب کی طرح فیض کی شاعری پر دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں جو کہ وقت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے۔ اس بارے اُن کی کیا رائے ہے دیکھتے ہیں:

''اب وقت آ گیا ہے کہ غالب اور اقبال کی طرح فیض احمد فیض کی ایک ایک

غزل، ایک ایک نظم، ایک ایک شعر بل کہ ایک ایک لفظ کی گرہیں کھولنے کے لیے باقاعدہ کام کیا جائے تا کہ اُن کا ایک مکمل نظامِ فکر متشکل ہو کر ہمارے سامنے آ سکے۔''

نتائجِ فکر کا بارہواں مضمون ہے 'عبیداللہ علیم کی وطن دوستی - ایک نئی جہت'۔ اِس میں مصنف نے عبیداللہ علیم کی وطن دوستی کے جذبے کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے تصورِ شعر و فن پر بھی بہت منطقی اور مفصّل بحث کی ہے۔ اُنہوں نے عبیداللہ علیم کے ہاں اِس جذبے کی انفرادیت کو بھی بہ خوبی واضح کیا ہے۔ فاضل مصنف نے اِس مضمون میں اپنے تصورِ شعر کی وضاحت اِن الفاظ میں کی ہے:

''شاعری محسوسات اور افکار کا برجستہ اظہار ہے۔''

اپنے اگلے مضمون میں مصنف نے ڈاکٹر انوار احمد کی ایک کتاب 'ایک ہی کہانی' کا تجزیہ 'ڈاکٹر انوار احمد - روشن آنکھوں والا کہانی نگار' کے عنوان سے کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس کتاب کا نیا ایڈیشن کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ 'پہلے سے سُنی ہوئی کہانی' کے نام سے سامنے آ چکا ہے۔

اپنے اِس مضمون میں شوکت نعیم قادری، ڈاکٹر انوار احمد کی شخصیت بہ طور افسانہ نگار اور اُن کے فنِ افسانہ نگاری کا بہت خوب صورتی سے تجزیہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ اِس کتاب میں موجود کہانیوں کے موضوعات اور اُن کی تکنیک کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں۔

کتاب کے اگلے دو مضامین انتہائی دل چسپ اور قابلِ توجہ ہیں۔ اِن میں پہلا مضمون 'گنجینۂ معنی کا طلسم' کے عنوان سے ہے۔ یہ عرش صدیقی کے افسانے 'باہر کفن سے پاؤں' کا تجزیہ ہے جب کہ دوسرے مضمون میں بھی عرش صدیقی کے ایک افسانے 'مور کے پاؤں' کا تجزیہ بہ عنوان 'آخری خواہش کی تعمیل میں' کیا گیا ہے۔ یہ تجزیے انتہائی منطقی ہیں۔ ان میں مصنف اِن دونوں افسانوں کے معنوی پہلوؤں کی گرہیں اس طرح کھولتا ہے کہ قاری کے ذہن اور سوچ کی گرہیں بھی خود بہ خود کھل جاتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتا ہے۔ عرش صدیقی کے یہ دونوں افسانے بہت معروف ہیں اور نقادوں کے لیے ہمیشہ باعثِ توجہ رہے ہیں۔ دونوں افسانے علامتی ہیں اور شوکت قادری کے مضامین جوان افسانوں سے متعلق ہیں۔ اُن کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اِس کتاب کا آخری مضمون انتہائی منفرد ہے۔ عنوان ہے 'کیا دو انبیاء کرامؑ کے اَجسادِ مُبارک کو خُوط کیا گیا؟'

سچ ہے انسان جس چیز کی تلاش میں ہوتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے اُس تک پہنچ جاتی ہے۔ شوکت نعیم قادری ہمیشہ ایسے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُن کے شوقِ تجسّس کو مزید مہمیز کرے اور ایسے موضوعات معلوم ہوتا ہے خود چل کر اُن تک آتے ہیں۔ کتاب کے آخر مضمون کا موضوع بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ عبدالحلیم شرر کا مشہور و معروف ناول 'فردوسِ بریں' بہت سے قارئین نے پڑھا ہوگا مگر اِس ناول

میں جس بات نے شوکت نعیم قادری کو capture کیا۔ بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی ہوگی۔

اس ناول میں دو انبیاء علیہم السلام حضرت یعقوبؑ و یوسفؑ کے اجسادِ مبارک کے حنوط ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اگرچہ ناول میں اِن کا ذکر سرسری آیا ہے مگر فاضل مصنف کے ذوقِ تجسّس کا کیا کہنا اُنہوں نے واقعی ایک تحقیق طلب موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ تحقیق کے لیے مصنف نے 'کتابِ مقدس' ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی تصنیف 'شرر کے تاریخی ناول اور اُن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' سے رُجوع کیا ہے۔ تحقیق انتہائی وقیع ہے، تاہم کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکا۔

اِس کتاب کے تمام مضامین کے تجزیے کے بعد ہم اس کے اُسلوب کی جانب آتے ہیں۔ زبان سادہ مگر انداز انتہائی دل چسپ اور خوب صورت ہے۔ کتاب انتہائی دل چسپ ہے اور ہر موضوع اپنی طرف کھینچتا محسوس ہوتا ہے۔ موضوعات کا چناؤ قابلِ تحسین ہے۔ مصنف نے ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے جو واقعی تحقیق طلب تھے، مضامین مختصر اور متناسب ہیں۔

آخر میں اُمید کی جاتی ہے کہ شوکت نعیم قادری اپنی اِس تحقیقی اور تخلیقی کاوش کو جاری رکھیں گے جو اُن کے فن میں مزید نکھار لانے کا باعث ہوگی۔

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

ہم مکاں کی موج میں، وہ لامکاں کی موج میں — ہر کوئی سرشار ہے، اپنے جہاں کی موج میں
کوئی ساحل تک پہنچتا، کم ہی آتا ہے نظر — ڈوبتے جاتے ہیں سارے، درمیاں کی موج میں
وہ تو کہیے، آ گئی کچھ کام بے بال و پری — ورنہ، ہم رُکتے، ہوائے رایگاں کی موج میں
ہر کوئی یاں، دائرہ در دائرہ محبوس ہے — محوِ گردش ہے زمیں بھی آسماں کی موج میں
اب کہاں ممکن، کسی صبحِ درخشاں کی نمود — اب کے سورج بہ گئے، اک کہکشاں کی موج میں
رینگتے لمحوں سے مر مر کر جو گزرے، تب کھلا — کٹ گئے کتنے زمانے، ناگہاں کی موج میں
لفظ کے ظاہر سے ہے، اندازۂ معنی، محال — کتنے دریا ہیں نہاں، کوہِ گراں کی موج میں
گھر سے نکلے تو کھلا تھا، سامنے بازارِ شوق — فائدہ آیا نظر، دل کو زیاں کی موج میں
یاد ہے کچھ کچھ، دلِ آوارہ کا آغازِ رقص — پھر کسی کو کیا خبر، دَورِ زماں کی موج میں
ثبت ہیں ریگِ رواں پر، میری ساری خواہشیں — میرے سارے خواب ہیں، ابرِ رواں کی موج میں
اے نگارِ ماورائیت، اِدھر بھی اک نظر — ہے ترا اک اک یقیں، میرے گماں کی موج میں
یہ وہ نکتہ ہے، جنابِ خضر بھی سمجھے نہیں — زندگی سے کٹ گئے، اک ''جاوداں'' کی موج میں
چل رہی ہے اُس طرف، دل میں کہیں کوئی ہوا — ہم اِدھر، محوِ سفر ہیں، کارواں کی موج میں
ضبط کر سکتا ہے اپنے آپ کو، کب تک کوئی — بہ گئی ہے شمع بھی، اپنی زباں کی موج میں
دام و دانہ چیز کیا، پھر آشیاں بھی ہیچ تھا — یوں اُڑے طائر، ہوائے آشیاں کی موج میں
تہ نشیں ہو جائے گا اک دن، یہ دریائے حیات — کچھ یہاں کی موج میں، اور کچھ وہاں کی موج میں
دل کے اندر رہ گئی سب وارداتِ دل، حبیب — حرف گونگے ہو گئے، زورِ بیاں کی موج میں

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

عریاں ہیں اَن کہی کے تقاضے نگاہ میں
کن منزلوں کا درد چمکتا ہے راہ میں

اک سیلِ زندگی ہے کہ تھمتا نہیں کہیں
دیکھو تو کوئی اُس نگہِ بے پناہ میں

عکسِ بدن سے یوں ہوئی گلنار، ہر نگاہ
تمیز اُٹھ گئی ہے سپید و سیاہ میں

پھلتی نہیں جو شاخِ تماشا، پھر اِس سے کیا
رقصاں ہو لاکھ رنگِ نمو، ہر گیاہ میں

جنگل کے اُس طرف کوئی پہنچے تو کس طرح
پیڑوں نے سخت جال بچھائے ہیں راہ میں

یکساں نہ تھا زمانہ، سو یکسو نہ ہو سکے
گزری ہے زندگی یونہی خواہ ونخواہ میں

تا چند اِس سے صرفِ نظر، اہلِ انتظار!
یہ مرحلہ تو آنا تھا آخر نباہ میں

یک لخت، جیسے ارض و سما زلزلا گئے
قرنوں کا کرب گونج اُٹھا، ایک آہ میں

اُس روز، وہ تو کہیے کہ دل آڑے آ گیا
ورنہ کچل گئے تھے، انا کی سپاہ میں

حکمِ ازل کے ساتھ بہر رنگ منسلک
مصروفِ بندگی ہیں، ثواب و گناہ میں

ممکن ہے اُٹھ ہی جائے کبھی پردۂ محال
فی الحال تو پڑے ہیں بڑے اشتباہ میں

پھر اُس کے بعد کس کو خبر، کس خلا میں ہوں
نکلا تھا گھر سے تیز ہواؤں کی چاہ میں

کس طمطراق سے ہیں خراماں، روش روش
بے چہرہ لوگ، پھول سجائے کُلاہ میں

فرصت ملے تو دیکھ، یہ فطرت کے کھیل بھی
بیٹھا ہے منہ چھپائے ہوئے کوہ، کاہ میں

کل بھی گلہ گزار نہیں تھا کسی کا، یہ
دل، مطمئن ہے آج بھی حالِ تباہ میں

پہنچا فلک پہ کارِ جنوں، میرؔ کی طرح
دیکھی ہے رات میں نے بھی اک شکل ماہ میں

اپنا ہی عکسِ ذات دکھائی دیا، حبیبؔ
صدیوں کے سوچتے ہوئے لمحوں کی تھاہ میں

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

لے کے اشکوں کا سفینہ تنہ نا ہا یا ھو
ہوں رواں سوئے مدینہ تنہ نا ہا یا ھو

اک عجب عالمِ وارفتگی و مستی ہے
یاد، مرنا ہے نہ جینا تنہ نا ہا یا ھو

منسکِ دیں سے الگ، مسلکِ دنیا سے جدا
دل کا ایک اپنا قرینہ تنہ نا ہا یا ھو

پیشِ سرکار، مرا مایۂ ہستی ہے یہی
یہ ندامت کا پسینہ تنہ نا ہا یا ھو

تا سحر، سوئے زمیں، محوِ سفر تھے افلاک
ذکرِ آقا میں شبینہ تنہ نا ہا یا ھو

اُن کے قدموں پہ جھکا سر تو کھلا اپنا ہُنر
کس بلندی کا ہوں زینہ تنہ نا ہا یا ھو

ہو کوئی خاص تو پھر عام بھی کر دیتے ہیں
اپنی الفت کا خزینہ تنہ نا ہا یا ھو

سنگ ریزوں میں تب و تاب کہاں تھی ایسی
ہو گئے روکشِ سینا تنہ نا ہا یا ھو

کتنے خورشید، تہِ خاک نہاں تھے ورنہ
اے خوشا، دیدۂ بینا تنہ نا ہا یا ھو

دل نے خود اپنی نگاہوں سے چھپا رکھا تھا
اک گراں قدر دفینہ تنہ نا ہا یا ھو

للہ الحمد، یہ آنکھوں میں دُر افشاں رہنا
ایک نیساں کا مہینہ تنہ نا ہا یا ھو

مُژدہ، اے تشنہ لباں، اِذنِ محبت ہے یہاں
روبرو بیٹھ کے پینا تنہ نا ہا یا ھو

صورتِ نشہ سنبھلتے ہی نہیں آپ میں رند
دیکھ کر، ساغر و مینا تنہ نا ہا یا ھو

دُھل گیا ایک ہی جرعے میں سب اندر کا غبار
کوئی نفرت ہے نہ کینہ تنہ نا ہا یا ھو

یوں دمکتا ہے حبیبؔ، اُن کا تصور، دل میں
جیسے، خاتم میں نگینہ تنہ نا ہا یا ھو

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

موج تھپیڑے سہنا ہے
دریا دریا بہنا ہے

وصل میں کارِ ہجر کرے
دل کا یہی تو لہنا ہے

پھر آپس میں کیسا بیر
ایک لحاف میں رہنا ہے

تیرا اپنا زیور ہے
میرا اپنا گہنا ہے

عقل کی عریانی مت پوچھ
جب سے عشق کو پہنا ہے

بیٹا ، عشق میں مر جانا
میر فقیر کا کہنا ہے

بوجھ سہی ، یہ عشق حبیبؔ
بوجھ یہی تو سہنا ہے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

عشق سے کیا شرماتا ہے
خود میں ڈوبا جاتا ہے

سوچ تو آخر مفت میں کیوں
اپنا آپ گنواتا ہے

جانا مجبوری ، پَر کون
جا کر واپس آتا ہے

پاگل منوا ، غم کا بوجھ
کیا ہنس ہنس کے اُٹھاتا ہے

سارے رشتے ٹوٹ گئے
ہاں ، اک درد کا ناتا ہے

اُس کے لطف کی بات نہ چھیڑ
سوئے درد جگاتا ہے

دیکھ کرشمے محبت کے
روٹھنے والا مناتا ہے

بیٹے کی صورت میں باپ
اپنے کو دہراتا ہے

یہ بھی ہے اک کھیل حبیبؔ
دل ، دل کو سمجھاتا ہے

☆☆☆

صابر ظفر

کسی کی یاد میں کھو کے ، کسی سے ہو کے الگ
گزاروں زندگی ، اس زندگی سے ہو کے الگ

سبھی کے ساتھ ہوں ، یہ بات الگ کہ سوچا تھا
میں تیرے ساتھ رہوں گا ، سبھی سے ہو کے الگ

میں ڈھونڈتا ہوں اُسے جو کہ تیرے نور سی تھی
اک اور روشنی اِس روشنی سے ہو کے الگ

چلوں نہ کس لیے اُس خوش خرام کے پیچھے
کسے ملا ہے خدا ، بندگی سے ہو کے الگ

جو بار بار مجھے آشنا سا لگتا ہے
نہ جی سکوں گا میں اُس اجنبی سے ہو کے الگ

میں ہو گیا ہوں الگ اِک جہان سے گویا
لگا ہے یوں مجھے ایک آدمی سے ہو کے الگ

اُسی کی یاد ، اُسی کا خیال ، اُسی کا ملال
اُسی کے واسطے بے چین ، اُسی سے ہو کے الگ

کروں تلاش کہ آسودہ چشمِ حیرت ہو
تری نگاہ کو ، نظارگی سے ہو کے الگ

سخن کی اور کوئی راہ چاہتا ہوں ظفرؔ
رواج پاتی ہوئی شاعری سے ہو کے الگ

☆☆☆

خاور اعجاز

دل کا تکیہ بھگو رہے ہو تم
کیا ہوا ہے کہ رو رہے ہو تم

کیوں نہیں سنتے میرے دل کی بات
جاگتے ہو کہ سو رہے ہو تم

حاصلِ عشق نا سہی لیکن
ایک امکان تو رہے ہو تم

اشک لکھتے ہو میرے دامن پر
داغ اپنے ہی دھو رہے ہو تم

تم سے ہی ٹوٹنا تھا شیشۂ جاں
میرا پندار جو رہے ہو تم

شہر میں نام اُچھال کر میرا
اعتبار اپنا کھو رہے ہو تم

دُور کے پانیوں میں لے جاتے
ساحلوں پر ڈبو رہے ہو تم

پاس آنے کا کہہ رہے ہو پر
اور بھی دُور ہو رہے ہو تم

خاور اعجاز

رسمِ پیکار چل رہی ہے کیا
شہر میں خار چل رہی ہے کیا

گردنیں کیوں جھکائیں ہم اپنی
کوئی تلوار چل رہی ہے کیا

سَر تو نیچے نظر نہیں آتا
صرف دستار چل رہی ہے کیا

اے ہوائے جنوں مرے ہمراہ
تُو بھی اُس پار چل رہی ہے کیا؟

رُک گیا تھا اگر وہیں منظر
پھر یہ دیوار چل رہی ہے کیا

کوئی رہتا نہیں تو سینے میں
سانس بیکار چل رہی ہے کیا

سانپ تو مر گیا تھا لیکن اب
اُس کی پھنکار چل رہی ہے کیا

نہر سے منہ لگائے بیٹھے ہو
دودھ کی دھار چل رہی ہے کیا

پہلے اُس کی زباں پہ تالے تھے
اب لگاتار چل رہی ہے کیا

☆☆☆

خاور اعجاز

سر پہ اوڑھے ردائے نم آلود
جھیل پر دو تھے سائے نم آلود

حُسن بھیگی ہوئی کہانی ہے
سب اشارے کنائے نم آلود

خشک ہے آنکھ اور سینے میں
چل رہی ہے ہوائے نم آلود

بھیگتا جا رہا ہے منظر بھی
آنکھ ہے یا ردائے نم آلود

میرے آنسو سکھاتی جائے ہوا
اور خود ہوتی جائے نم آلود

خاور اعجاز

آئنہ دار ہو کے دیکھتے ہیں
اُس کے اک بار ہو کے دیکھتے ہیں

یوں بھی بیکار ہی پڑے ہیں ہم
چلیے درکار ہو کے دیکھتے ہیں

کون لکھتا ہے ان نوشتوں کو
پسِ دیوار ہو کے دیکھتے ہیں

اِس طرف تو کوئی نہیں شاید
اب اُفق پار ہو کے دیکھتے ہیں

کیسے کرتا ہے وہ کرم اپنا
ہم گنہگار ہو کے دیکھتے ہیں

خودپسندی میں کیا کیا ہم نے
خود سے بیزار ہو کے دیکھتے ہیں

☆☆☆

خاور اعجاز

اپنی ہستی ڈبو کے دیکھتے ہیں
ہم کبھی اُس کے ہو کے دیکھتے ہیں

شاید آ جائے چشمِ خواب میں وہ
رات آئی ہے سو کے دیکھتے ہیں

خاکِ دل پھول کوئی لے آئے
آنسوؤں سے بھگو کے دیکھتے ہیں

سو گئی ہو نہ ساعتِ گل بخت
کوئی کانٹا چبھو کے دیکھتے ہیں

کیسی لگتی ہیں دکھ کی مالا میں
چند خوشیاں پرو کے دیکھتے ہیں

ہو بھی سکتا ہے اُس کو پالیں ہم
خود کو اک بار کھو کے دیکھتے ہیں

ہاں سنا ہے کہ غم بہلتا ہے
اے دلِ زار رو کے دیکھتے ہیں

شاید اُگ آئے وصل کی کونپل
دل میں اک ہجر بو کے دیکھتے ہیں

زندگی ! تیری کیا حقیقت ہے
تجھ سے کچھ دُور ہو کے دیکھتے ہیں

☆☆☆

خاور اعجاز

کارِ بیکار کر کے دیکھتے ہیں
دَر کو دیوار کر کے دیکھتے ہیں

کیسی نکلے گی صورتِ تعبیر
خواب مسمار کر کے دیکھتے ہیں

وہ ہمیں کتنا چاہتا ہوگا
اُس سے ہم پیار کر کے دیکھتے ہیں

ختم ہو جائے یہ گھٹن شاید
کوئی اظہار کر کے دیکھتے ہیں

آ رہی ہے کہاں سے بوئے دوست
آگ گلزار کر کے دیکھتے ہیں

سوچتے ہیں نیا سفر کوئی
یہ افق پار کر کے دیکھتے ہیں

کیسے اوجھل ہوا وہ نظروں سے
ذرّہ کہسار کر کے دیکھتے ہیں

شوق کی حد نہیں کوئی لیکن
شوق اک بار کر کے دیکھتے ہیں

جب عداوت ہی اُس سے ٹھہری تو
تیر تلوار کر کے دیکھتے ہیں

فہیم شناس کاظمی

ہمیشہ جام بکف مسندِ گناہ سے اُٹھے
عجیب نشہ تھا جب خواب کی پناہ سے اُٹھے

گھنیرے سبز شجر پر کھلا ہے خواب گلابی
بہت سے ہاتھ پھر اس کی طرف نگاہ سے اُٹھے

درونِ شام کھلے سر بھٹکتی کوئی خاموشی
فصیلِ شہر سے بادل بہت سیاہ سے اُٹھے

ہر ایک دل میں وہ محشر جگا گئے کہ نہ پوچھو
یہ کیسے لوگ تری خاص جلوہ گاہ سے اُٹھے

خدا گواہ کہ میں جنگ جیت سکتا تھا لیکن
مرے حریف مری اپنی ہی سپاہ سے اُٹھے

مگر وہ خاک بسر لوگ جو کہ عرش نشیں ہیں
اور ایک سمت وہ سر جب اُٹھے کلاہ سے اُٹھے

فہیم شناس کاظمی

کس میں ہم جیسا حوصلہ ہوگا
جس نے ہونے کا دُکھ سہا ہوگا

اب تھکن سے نڈھال لگتا ہے
راستہ دُور تک چلا ہوگا

دُھند منظر پہ گر رہی ہو جہاں
صرف بینائی سے بھی کیا ہوگا

یہ تصور نہ ٹوٹ جائے کہیں
وہ اگر مل گیا بُرا ہوگا

رات جنگل میں ڈھونڈتی ہے کسے
چاند صحرا میں سو گیا ہوگا

چاندنی گھل گئی سمندر میں
وہ کسی خواب میں ہنسا ہوگا

دھوپ چھاؤں میں ڈھلتی جاتی ہے
نقشِ پا اس کا مل گیا ہوگا

ربط اس سے جو ہو گیا ہے شناسؔ
اب کسی سے نہ رابطہ ہوگا

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

جامۂ تنگ کی باتیں کیجے
اُس کے انگ انگ کی باتیں کیجے

باتیں کرنے میں کوئی عیب نہیں
ہاں ، مگر ڈھنگ کی باتیں کیجے

اپنے ماضی سے جڑے رہنے کو
دور افرنگ کی باتیں کیجے

آپ کی مرضی یہی ہے تو پھر
شوق سے جنگ کی باتیں کیجے

اہلِ دانا کو یہی جچتا ہے
کیجے ، فرہنگ کی باتیں کیجے

چھوڑیے لعل و گہر کی باتیں
حُسنِ صد رنگ کی باتیں کیجے

کچھ نہ کچھ پاسِ ہنر لازم ہے
صوت و آہنگ کی باتیں کیجے

آپ سے کس نے کہا تھا ساحرؔ
آٹھویں رنگ کی باتیں کیجے

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

شب کو سونے سے خوف آتا ہے
اپنے ''ہونے'' سے خوف آتا ہے

یوں نہ ہو ، سب پہ بھید کھل جائے
کھل کے رونے سے خوف آتا ہے

اپنے کھونے کا غم نہیں مجھ کو
اُس کے کھونے سے خوف آتا ہے

یوں ہی ہر غم گسار کے آگے
رونے دھونے سے خوف آتا ہے

جانے کیوں مجھ کو نیلے پانی میں
سر ڈبونے سے خوف آتا ہے

میں کہاں اور کہاں یہ بارِ گراں
رنج ڈھونے سے خوف آتا ہے

جانے اب کے بھی فصل اُگے نہ اُگے
بیج بونے سے خوف آتا ہے

ہم فقیرانِ شہر کو ساحرؔ
چاندی ، سونے سے خوف آتا ہے

منیر راہیؔ

یوں نہ تو آنکھیں دکھا اے چاندنی
مجھ کو بس اپنا بنا اے چاندنی

زندگی بھر ساتھ میرا کیوں دیا
تو بھی تو کچھ سچ بتا اے چاندنی

جس میں اپنے پیار کی سچائی ہو
مجھ کو وہ قصہ سنا اے چاندنی

اس قدر آنکھیں تری پتھرائی کیوں
راز سے پردہ اُٹھا اے چاندنی

جس کا حاصل پیار کی سوغات ہو
زخم ایسا بھی لگا اے چاندنی

میں اگر سچا نہیں تو کیا ہوا
خود کو تو سچا بنا اے چاندنی

میرا بھی اپنا وطیرہ دوستو
تیری بھی اپنی ادا اے چاندنی

بھید مجھ پر کب کھلا ہے یہ منیرؔ
تو بنی کیسے خدا اے چاندنی

منیر راہیؔ

میرے لوگوں کی یہ بھی نشانی نہیں
اس محبت میں کوئی کہانی نہیں

میں نے اس کو سنبھالا بہت دیر میں
میری دنیا تو اتنی پرانی نہیں

میں یقیں تو سبھی کو دلاتا رہا
بات لوگوں نے میری تو مانی نہیں

جس میں کردار تیرا بھی موجود ہو
میرے حصے میں ایسی کہانی نہیں

یہ کنارا کہاں پہ ٹھہرنے لگا
جہاں دریا کی کوئی نشانی نہیں

یار لوگوں نے مجھ سے بس اتنا کہا
تیرے جذبوں میں چاہت پرانی نہیں

ایک چہرہ جسے میں محبت کہوں
لوگ کہتے ہیں تیرا وہ جانی نہیں

مجھ کو اصرار کرنا پڑے گا منیرؔ
بات اُس نے تو ایسے بتانی نہیں

☆☆☆

شفیق آصف

فلک پر اک ستارا جاگتا ہے
مقدر جب ہمارا جاگتا ہے

پرندہ جب کوئی پانی پہ اُترے
سمندر کا کنارا جاگتا ہے

مچلتی ہے جو دل میں تیری خواہش
مری آنکھوں میں پارہ جاگتا ہے

میں شہرِ خواب میں جب بھی گیا ہوں
کہیں سے اک اشارہ جاگتا ہے

بلاتی ہے کسی چلمن کی جنبش
نظر میں پھر شرارہ جاگتا ہے

جہاں ہم منفعت کا سوچتے ہیں
وہاں آصفؔ خسارہ جاگتا ہے

☆☆☆

شفیق آصف

وہ جو میرے گمان میں ہے
اک عجب عکس دھیان میں ہے

میرے تن کا نصیب ٹھہرے
تیر جو بھی کمان میں ہے

رزق کی ہے تلاش جس کو
وہ پرندہ اُڑان میں ہے

کون اُس کو بھلا بگاڑے؟
وہ جو تیری امان میں ہے

کھوج ہے جس کی وہ تو آصفؔ
تیرے دل کے مکان میں ہے

شفیق آصف

بدلتے موسموں کی بے رُخی اوڑھے ہوئے ہیں
یہ چہرے کیا ردائے بے حسی اوڑھے ہوئے ہیں

یہاں پھر ظلمتوں کی حکمرانی کیوں نہ ہوتی
یہاں تو ماہ و انجم تیرگی اوڑھے ہوئے ہیں

وہی جو ساتھ تھے کل تک مری پسپائیوں میں
وہی غم خوار اب کے دشمنی اوڑھے ہوئے ہیں

جنہیں اہلِ نظر صحرائے جاں گردانتے ہیں
وہ دریا چشم کے ہیں، تشنگی اوڑھے ہوئے ہیں

یہاں آصفؔ عجب موجِ سراب اُٹھی ہوئی ہے
کہ جو زندہ نہیں وہ زندگی اوڑھے ہوئے ہیں

☆☆☆

شفیق آصف

دریا جو تشنگی کا مداوا نہ کر سکے
لیکن ہمارے صبر کو صحرا نہ کر سکے

وہ جن کے کنج لب سے شفق پھوٹتی رہی
وہ بھی دکھوں کے بوجھ کو ہلکا نہ کر سکے

مجھ کو تو میرا عزم زرہ کی مثال تھا
دشمن مرے وجود کو پسپا نہ کر سکے

پائی ہے ہم نے جرم وفا کی سزا بہت
توبہ کی سوچتے رہے توبہ نہ کر سکے

مانا کہ تم نے ترکِ تعلق کی سوچ لی
پھر بھی ہماری سوچ کو تنہا نہ کر سکے

عطاء الرحمٰن قاضی

کل ملا کیا خواب سا چہرہ مجھے
کر گیا کچھ اور بھی تنہا مجھے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے آپ کو
لے گیا جانے کہاں رستہ مجھے

اُس کی اچھائی کی دوں میں کیا دلیل
جب بھی دیکھا وہ لگا اچھا مجھے

کیا خبر تھی ہے وہی اصلِ سراب
دیکھنے میں جو لگا دریا مجھے

ہر طرف یہ ملگجی یادوں کی دھند
کس نگر میں وقت لے آیا مجھے

روز ملتے ہیں مگر ، بیگانہ وار
حضرتِ دل نے بھی کب جانا مجھے

مثلِ قفقس راکھ کر دے گا کبھی
صاعقہ بردوش اک نغمہ مجھے

ڈھونڈتا ہے اک بگولا آج بھی
کھینچتا ہے آج بھی صحرا مجھے

میں حقیقت تھا کبھی ، اک وہم ہے
کیوں بنا ڈالا ہے افسانہ مجھے

کھو گیا ہے خود پسِ گردِ زماں
ڈھونڈنے نکلا تھا جو لمحہ مجھے

خود بخود برباد ہو جاؤں گا ''غم''
کب تلک آباد رکھے گا مجھے

پھر نظر آیا پسِ زنگارِ شب
اک چمکتی صبح کا چہرہ مجھے

محبس تعبیر سے باہر نکال
خواب سا منظر کوئی دکھلا مجھے

میں دلِ شب میں بھٹکتا ہی رہا
کھینچتا تھا عکسِ نادیدہ مجھے

میں چراغِ وصل تھا اس نے عطاؔ
طاقِ نسیاں میں سجا رکھا مجھے

☆☆☆

عطاالرحمٰن قاضی

مہرباں ہم پہ ترا غم جو ذرا ہونے لگا
نخلِ افسردہ جاں پھر سے ہرا ہونے لگا

ایک اک کر کے بجھے جاتے ہیں وعدوں کے چراغ
دفعتًا اہلِ تمنا کو یہ کیا ہونے لگا

ایک عالم تھا سرِ خلوتِ جاں ، رات گئے
سجدۂ شوق جو یاروں سے ادا ہونے لگا

میں کہ احساس کے پاتال میں اترا تھا ابھی
وہ جو تھا میرے قریں مجھ سے جدا ہونے لگا

دل میں اتری ہے وہ شامِ شفق آلود عطاؔ
رنگ یادوں کا بھی مائل بہ حنا ہونے لگا

عطاالرحمٰن قاضی

آنکھ کھلتے ہی کھلا پردہ ہر اک اسرار کا
در نظر آنے لگا جب رنگ اُڑا دیوار کا

ایک منزل پر پہنچ کر دوسری منزل کی دُھن
سوچیے تو جیت بھی ہے سلسلہ اک ہار کا

دل میں خواہش بھی مچلتی ہے مگر لاحاصلی
سر میں سودا بھی سمایا ہے مگر بیکار کا

وضع داری نے بچایا کب بکھرنے سے ہمیں
دل میں غم اب آ بسا ہے کاہشِ پندار کا

جیسے کل کی بات ہے شہرِ تمنا میں عطاؔ
دور تک پھیلا ہوا تھا سلسلہ اشجار کا

☆☆☆

عطاالرحمٰن قاضی

ہر گام پہ پہرے ہیں ابد اور ازل کے
میں جاؤں کہاں وقت کے زنداں سے نکل کے

یا منظرِ موہوم بھی مٹ جائے سراسر
یا دودِ تحیر سے وہ صورت کبھی جھلکے

ڈھے جائے مبادا یہ تری لغزشِ پا سے
رکھ پاؤں ذرا قصرِ تماشا پہ سنبھل کے

وہ رات گئے اب بھی سرِ حوضِ تمنا
کیا کیا نہ کھل اُٹھتے ہیں معاً پھول کنول کے

رقصاں ہیں بگولے کی طرح لمحہ بہ لمحہ
ہم لوگ مسافر ہیں عطاؔ دشتِ غزل کے

☆☆☆

عطاالرحمٰن قاضی

اور تو اس دل میں کیا رکھتے ہیں ہم
دولتِ حرفِ دُعا رکھتے ہیں ہم

وہ نشاطِ غم ہو یا کربِ نشاط
ایک ہنگامہ بپا رکھتے ہیں ہم

تاب جس کی کوئی لا سکتا نہیں
خواب کا وہ آئنہ رکھتے ہیں ہم

جانے کب آجائے گم گشتہ خیال
دل کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں ہم

یہ کھلا ہے جو عطاؔ بابِ نظر
کچھ تو امکانِ ہوا رکھتے ہیں ہم

عطاالرحمٰن قاضی

دل ، غریقِ شعاعِ حیرانی
آئنہ ہے متاعِ حیرانی

اک کھنڈر ہوں انا کا میں جس میں
گونجتی ہے صدائے حیرانی

آئنے کے حضور ، آئینہ
دیکھنا ! اجتماعِ حیرانی

اب بھی قائم ہر ایک آنکھ میں ہے
نقطۂ اختراعِ حیرانی

شوخیِ عکس رایگاں ہے عطاؔ
باعثِ انتفاعِ حیرانی

عطاالرحمٰن قاضی

بارے دل میں کوئی احساس ہمکتا ہے ہنوز
روز ، اس جھیل میں اک چاند اترتا ہے ہنوز

جذب ہو جاتا ہے اک یاد کے صحرا میں کہیں
وہ جو دریا مری آنکھوں سے نکلتا ہے ہنوز

ہر طرف تیرگیِ شب کا فسوں ہے لیکن
اک ستارہ افقِ جاں پہ چمکتا ہے ہنوز

خواب بن کر مری آنکھوں میں بسا تھا جو کبھی
پھول بن کر سرِ ہر شاخ مہکتا ہے ہنوز

دل کی اس منزلِ ویراں سے دبے پاؤں ، عطاؔ
شام ڈھلتے ہی اک آسیب گزرتا ہے ہنوز

☆☆☆

شارق بلیاوی

حیرت آنگیں کارِ شوقِ دل رہا
کھویا جو کچھ میں وہی حاصل رہا

بس یہی اک غم ہے اپنی موت کا
قاتلوں میں وہ مرے شامل رہا

بزدلی انجام کارِ موت ہے
خوف کا ہر فیصلہ باطل رہا

لوگ چاہے جو کہیں میرے لیے
زندگی کا تجربہ مشکل رہا

بات قسمت کی بھی ہو پر بیشتر
آدمی کے دکھ کا باعث دل رہا

تھک گئے کچھ اور منزل پا کے ہم
حاصلِ منزل بھی لا حاصل رہا

جزوِ فطرت لغزشیں شارقؔ رہیں
آدمی ہے کون جو کامل رہا

شارق بلیاوی

ہر خوشی کے موڑ سے بچتا رہا
عشق میں یہ تجربہ اچھا رہا

کارواں کے ساتھ تو چلتا رہا
پھر بھی گھبرایا ہوا تنہا رہا

حق زیبائش کو چاہے ایک عمر
ہم ہوئے درگور وہ سجتا رہا

کیا کہوں گا مجھ سے گر رضوان کہے
خلد سے جانا ترا کیسا رہا؟

ایک پتھر ٹھہرے پانی پر گرا
دائرہ اُبھرا جو وہ بڑھتا رہا

جستجو اپنی میں کرتا کس طرح
روبرو ہر دم ترا چہرا رہا

ہم بھی ضدی تھے وفا کرتے رہے
وہ بھی ضدی تھا جفا کرتا رہا

زندگی میں خاک شارقؔ ہم جیے
موت کا ہر وقت اک دھڑکا رہا

☆☆☆

حصیر نوری

نمایاں کرب کی لہریں ہوئیں زخموں کے پیکر میں
یہ جلتے بجھتے تارے کیوں اُتر آئے مرے گھر میں

مری نظروں سے دیکھو تو نوشتہ سامنے آئے
اسے پڑھ کر سنا دو تم جو لکھا ہے مقدر میں

تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں باقی بچا لیکن
جسے بھی دیکھئے وہ ہے بڑا بننے کے چکر میں

اگر موقعہ ملے تو کاتب تقدیر سے پوچھوں
کہ تو نے لکھ دیا ہنگامہ کیوں میرے مقدر میں

مرے ہر سمت پھیلا ہے مسافت کا سیہ جنگل
جلا کر رکھ دیا ہے میں نے خود صدیوں کو پل بھر میں

پلا دے زہر ایسے میکشوں کو آج اے ساقی
تقاضے زندگی کے جو ڈبو دیتے ہیں ساغر میں

ہمارے مسئلوں کا حل نکل آئے حصیرؔ اب تو
کہ ہم تو بھاپ کی صورت اُبھر آئے سمندر میں

حصیر نوری

سورج کو میرے مدِ مقابل میں لا کے دیکھ
ممکن اگر ہو تجھ سے تو آنکھیں ملا کے دیکھ

مجھ کو سنوار تو نہ کسی اور کے لیے
صرف اپنے واسطے مجھے اپنا بنا کے دیکھ

جان بہار آئے گا اک روز تیرے پاس
راہوں میں تُو خلوص سے آنکھیں بچھا کے دیکھ

کوئی بھی اب بھروسے کے لائق نہیں رہا
میں بھی نہیں ہوں تو بھی نہیں آزما کے دیکھ

انجام کار گم نہیں سوچوں کے دشت میں
آنکھوں سے اجتناب کا پردہ اُٹھا کے دیکھ

اس راہ پر کہ جس سے گزر کر ہم آئے ہیں
اے خضر کر مشاہدہ کچھ دُور جا کے دیکھ

دو دن کی دوستی نے تجھے کیا دیا حصیرؔ
اب دشمنی کی ریت کو آگے بڑھا کے دیکھ

☆☆☆

حصیر نوری

صرف خاموش رہے زور سے بولے نہ کوئی
اس جگہ برف کی دیوار ہے بیٹھے نہ کوئی

منزلیں خود ہی قدم چومیں گی آگے بڑھ کر
ایک ہی ساتھ رہے شرط ہے بچھڑے نہ کوئی

تپتے صحراؤں کے اطراف میں چلنے والو
غم کے ہجراں میں تنہا تمہیں چھوڑے نہ کوئی

سب ہی شامل ہیں بجا طور پر سلجھانے میں
حل معمے کا نہیں ہے تو پھر اُلجھے نہ کوئی

اس کی قسمت میں جو ہے تیرے مقدر میں نہیں
اس کسوٹی پہ کسی شخص کو پرکھے نہ کوئی

بے کرم لمحوں میں اب دھوپ کی یورش ہے بہت
دل میں اب بغض و حسد پال کے رکھے نہ کوئی

غم کو ہنستے ہوئے سہہ جاتے ہیں ہم لوگ حصیرؔ
عشق اک روگ ہے اس روگ کو پالے نہ کوئی

☆☆☆

حصیر نوری

ایسا لگتا ہے کوئی سایہ ہوں میں
خواب کا عالم ہے اور چلتا ہوں میں

یوں بظاہر خاک کا پتلا ہوں میں
قدسیوں کا قبلہ و کعبہ ہوں میں

اس لیے انسان ہیں سب محترم
پیار کی قدروں کا رکھوالا ہوں میں

مجھ میں گم ہیں آفتاب و ماہتاب
گو بظاہر خاک کا ذرہ ہوں میں

پاس آیا ہی نہیں برسوں سے وہ
عمر بھر جن کے لیے ترسا ہوں میں

حادثوں نے چھین لی پہچان تک
اس لیے اب شہر میں تنہا ہوں میں

مجھ سے وسعت کا ہنر سیکھو حصیرؔ
دشت و صحرا کی طرح پھیلا ہوں میں

شہاب صفدر

اپنا لگتا ہے یا نہیں لگتا
بے وفا ، بے وفا نہیں لگتا

مجھ کو اچھا تو کیا لگے گا وہ
ہاں زیادہ بُرا نہیں لگتا

کیا غرض اس سے تجھ کو اے دُنیا
وہ مرا کیا ہے کیا نہیں لگتا

عشق وہ پل ہے جس میں صدیوں کا
فاصلہ فاصلہ نہیں لگتا

کیا قیامت ہے دور کا مہتاب
پاس سے یوں بھلا نہیں لگتا

ہم وہ موسم گزار بیٹھے ہیں
زخم جب زخم سا نہیں لگتا

اے خدا رحم! عزم طوفاں سے
ناخدا آشنا نہیں لگتا

اب تو یوں ہے کہ اپنا غارت گر
کوئی اپنے سوا نہیں لگتا

جانے اِس گھر میں کیا کمی ہے شہابؔ
دل تمہارا ذرا نہیں لگتا

☆☆☆

شہاب صفدر

لمحہ بھر شاد بھی نہیں کرتا
اور برباد بھی نہیں کرتا

اِس قدر عام ہو گیا ہے ظلم
کوئی فریاد بھی نہیں کرتا

اتنے بے حس کہ نغمۂ شادی
ہم کو ناشاد بھی نہیں کرتا

مرگ آسا سکوت طاری ہے
دل تجھے یاد بھی نہیں کرتا

کیا غضب ہے کہ شہریارِ جمال
فکرِ بیداد بھی نہیں کرتا

محرمِ دل وہ کام کرتا ہے
جو کہ ہمزاد بھی نہیں کرتا

مل کے پھولے نہیں سماتے ہم
وہ کچھ ارشاد بھی نہیں کرتا

درد وہ جائیداد ہے کوئی شخص
وقفِ اولاد بھی نہیں کرتا

مُنکرِ حکم تو نہیں میں شہابؔ
لیکن اب صاد بھی نہیں کرتا

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

''انگارے'' فروری ۲۰۰۵ء موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا اداریہ مختلف موضوعات پر کھل کر لکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ لفظ سے لفظ جڑا ہوا اور با مقصد ترجیحات کا تعین آپ کے اداریے کا خاصا ہے۔ مشفق خواجہ کی وفات سے ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے، اُن کی اچانک وفات کے بارے میں روزنامہ ''جنگ'' میں جناب عطاالحق قاسمی کا کالم پڑھا تو ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے اُن کے بارے مختصراً لکھا ہے یعنی حوالے کے طور پر مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب مشفق خواجہ پر تفصیلی لکھیں گے۔

''غالب کا ذوق الٰہیات مشکور حسین یاد کی نظر میں'' ایک تحقیقی مضمون تھا جس سے میں نے بے حد استفادہ کیا۔ روبینہ شاہین نے ''انگارے'' کے قارئین کو اپنی اس تحقیقی کاوش سے خوب روشناس کرایا۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین نے جمالیات کے موضوع کو بڑے خوب صورت انداز میں شروع کیا گویا ''معاشرے کے تاریخی ارتقاء کے دوران سماجی شعور کی متنوع صورتوں نے خود کو آدمی کی روحانی زندگی اور روحانی فعالیت کے مختلف سانچوں میں ڈھال لیا۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی مراحل سے جمالیاتی محسوسات، تجربات اور ادراکات بھی ان میں شامل ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں سماجی شعور کی ایک معینہ ہیئت ارتقا پذیر ہوئی جس میں انسان کے حقیقت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی روابط نے خود کو مستحکم کیا، ایک سانچے میں ڈھالا اور ترقی کی منزلیں طے کیں، یہ ہیئت ہی آرٹ ہے۔''

کسی بھی مضمون نگار کا سب سے بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ مضمون کا آغاز کس پیرائے اور کون سے لفظوں سے کرتا ہے اگر وہ آغاز اور لفظ موضوع کی مناسبت سے مضمون کے وجود میں سمونا شروع ہو جائیں تو وہ تحقیقی مضمون ایک روایت کا درجہ پا لیتا ہے۔ ابن حسن کا مضمون ''ادب اور معروضی حقیقت'' ایک سائنسی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے دقیق موضوع ہے۔ مصنف کا انتخاب خوب صورت اور تحقیق پر مبنی ہے۔ خاص طور پر ''شعور کنندہ اور شے کی ہم آہنگی، شعور اور وجود کی ہم آہنگی کا اظہار نظریہ اور عمل کی ہم آہنگی ہے۔'' یہ مختصر لفظوں میں با مقصد نقطۂ تحریر ہے۔

ممتاز اطہر کی نظمیں مجھے بے حد پسند آئیں اور اشتیاق پیدا ہوا کہ ان کے شعری مجموعے پڑھے جائیں کیونکہ ان کی نظموں میں گزرے ہوئے کل کے لمحوں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، ان کی نظمیں ان کے محسوسات کی سچائیوں کا خوب صورت ترین اعتراف ہیں۔ چینی ادب سے انتخاب ''پاگل آدمی کی ڈائری'' ایک اچھی کہانی ہے جاگیرداری کے خلاف ایسی کہانیوں کی ضرورت آج کے اس دور میں کہیں

زیادہ ہے۔ ایسی کہانیوں کے انتخاب کے لیے خالد فتح محمد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ''مسجد کی آنکھیں'' پاکستان کی مجموعی حالت کی عکاس ہے قدم قدم پر خطرہ اور وہ بھی جان لیوا خطرہ..... کہانی نویس نے مسجد کے اندر سہمے ہوئے خوف کو آنکھیں اور سوچ دے کر پورے ملک میں پھیلی یاسیت کو زبان دے دی ہے۔ لیاقت علی صاحب کی کہانی ''خلش'' ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے عوامل کی خوب صورت ترین نشاندہی ہے۔ یہ تصنیفات ہمارے پاکستان کے معاشرتی سیٹ اپ کی نشان دہی کر رہی ہیں اور ایک بچے کے جذبات اس ملک کے شہریوں کے جذبات کی نشان دہی کر رہے ہیں اس قدر اچھا افسانہ لکھنے پر افسانہ نگار قابل تعریف ہیں۔

نظموں میں ''اقدار کی صلیب'' ایک ایسا تجزیہ ہے جو سجاد مرزا قارئین کو پیش کر رہے ہیں۔ خصوصاً ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے ادب کے نام کو بیچا کچھ اس طرح
جو کچھ نہ چھپنا چاہیے تھا وہ بھی ہے چھپا

سجاد مرزا کی یہ نظم ان کے تجزیاتی تناظر کی خوب صورت عکاسی کر رہی ہے گویا کہ ہر شعر اپنے اندر ماضی و حال کی داستان لیے ہوئے ہے اور سب سے آخر میں تمام شعراء کی غزلیں بھی پسند آئیں۔ قاضی حبیب الرحمٰن کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا:

سیاہ راکھ میں لپٹے ہوئے صحیفوں میں
پرانے وقتوں کی اک داستان روشن ہے

ڈاکٹر انور سدید کی غزلیں مختلف جرائد میں پڑھتا رہتا ہوں اور ان کے تجزیے بھی، غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں

زندگی کے راستے میں جو کہیں گم ہو گئے
ڈھونڈتی ان کو رہیں خوابوں میں آنکھیں صبح تک

یہ شعر کہیں مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں سدید صاحب نے تو نہیں کہا.....؟

خاور اعجاز کی غزلیں ان کا خوب صورت شعری ذوق پیش کرتی ہیں۔ ان کی تمام غزلیں خوب سے خوب تر ہیں ان تمام پر لکھنا چاہوں تو صفحے درکار ہوں گے اور یہ صفحات شاید ''انگارے'' افورڈ نہ کر سکے۔ بہر حال ایک شعر قارئین کے ذوق مطالعہ کے لیے

ہمارے ہاتھ سے سب کچھ نکل بھی سکتا ہے
دیا جلائیں تو منظر بدل بھی سکتا ہے

اور اس کے بعد حصیر نوری ہیں ان کا کلام ''انگارے'' میں پڑھنے کو ملتا رہتا ہے۔ دیگر شعراء کرام کی طرح ان کا یہ شعر

میں بہت دیر سے جاگا ہوں پر جاگا تو سہی
تھپکیاں دے کے مجھے پھر نہ سلایا جائے

شارق بلیاوی کی غزل کا یہ شعر قابل غور ہے

بے خبر وقت میری ذات سے تھا
یا کہ دانستہ بھلایا مجھ کو

صابر عظیم آبادی کی غزل میں یہ شعر

مرے حالات کو بھی دیکھ لیتے
حریم ذات سے باہر نکل کر

ایک خوب صورت کاوش ہے جو ''انگارے'' کے صفحات کی زینت بنے۔ منیر راہی کا یہ شعر:

ہمیں دے دو کسی کی روشنی بھی
ہمیں سورج ادھورا لگ رہا ہے

صاحب نوید کا یہ شعر ایک شاعر کے محسوسات کی خوب صورت عکاسی ہے

سکوت شب ہے تیری آرزو ہے اور پورا چاند
مرے نغمات پر رقصاں سبو ہے اور پورا چاند

اور سب سے آخر میں ظفر اقبال نادر کا یہ شعر

اپنے حق میں جب وہ پاتے کچھ نہیں
غور سے سنتے سناتے کچھ نہیں

مختصراً ''انگارے'' کے پورے شمارے کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ تفصیلی نہیں جستہ جستہ ہے۔ آپ کی کاوشیں ہمارے لیے مثال کا درجہ رکھتی ہیں اور ہمیں ہر ماہ خوب صورت تخلیقات پڑھنے کو میسر آتی ہیں۔

(جمشید ساحل۔ لیہ)

''انگارے'' موصول ہو رہا ہے اور اس کی باقاعدگی مکالمے کی فضا کے آثار پیدا کر رہی ہے۔ ہمارے یہاں اس کی ''طلب'' میں اضافہ ہو رہا ہے جو خوش آئند ہے کیونکہ اشیائے صرف کی ''طلب'' کے عہد میں ادبی رسائل کی طلب میں اضافہ ہونا ایک حلقے کے لیے اچھا تو دوسرے کے لیے بُرا شگون ہے۔ آپ نے گزشتہ چند شماروں میں ادبی اداروں کی سربراہی میں تبدیلی وغیرہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا اور ''حروفِ زر'' میں بھی انتظامی میزوں کی لمبائی چوڑائی پر کچھ باتیں پڑھنے کو ملیں۔ سماجی سطح پر جو حقیقت موجود ہے اسے اجاگر کرنے اور اپنا ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت آج کہیں زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ میرا اشارہ اُردو بازار، لاہور کی مرکزی سڑک پر واقع اُردو مرکز اور اُردو اکیڈمی سندھ کراچی کے صوبائی مرکز کی

طرف ہے۔ یہ معاملہ مجلس ترقی ادب کی سربراہی چھن جانے یا مل جانے سے زیادہ اہم ہے۔ چند ایک سال قبل ہی لوہاری دروازے کے سامنے اُردو بازار کی قیمتی ترین جگہ پر یہ دفتر نہایت ہی خستہ حالت میں تھا۔ اسے دیکھ کر ۱۹۴۷ء کے لاہور کا نقشہ یاد آتا تھا۔ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی اور اُردو مرکز کی مطبوعات وہاں سے مل جایا کرتی تھیں اور کوئی کتب فروش کہاں یہ مطبوعات رکھتا تھا۔ آج وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو دل خوش ہوا کہ سڑک سے تقریباً تین فٹ نیچے موجود فرش سڑک کے برابر کر دیا گیا ہے اور نہایت ہی قیمتی اور نفیس سنگ مرمر بچھا دیا گیا ہے۔ اندر کی دیواریں تو کجا باہر کی اکھڑی ہوئی دیواریں اب نہایت بیش قیمت ٹائلوں سے مزین ہیں۔ محرابی دروازوں، کھڑکیوں کے دیمک زدہ تختوں کی بجائے دروازے ایستادہ ہیں کہ جن میں نہایت اعلیٰ اور چمکتے ہوئے شیشے اور ان پر موجود نقش و نگار کسی آسودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ اندر جا کر دیکھا تو وہاں اُردو اکیڈمی سندھ کا نام و نشان نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ دفتر باہر سیڑھیوں پر منتقل ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ اس عمارت کے باہر ایک کونے پر پھلوں کی ٹوکری میں اکیڈمی کی مطبوعات دھری تھیں۔ یقین نہ آیا تو دائیں بائیں بیٹھے ہوئے چھابڑی والوں نے بتایا کہ اُردو اکیڈمی سندھ اور اُردو مرکز کی چھابڑی یہی ہے اور متعلقہ آدمی تالہ لگا کر نماز پڑھنے گیا ہے۔ ان ٹوکریوں کے اوپر کپڑا ڈالنے کو تالہ لگانے سے تعبیر کیا گیا تھا۔

آج کل میں اسلام آباد میں بین الاقوامی اُردو کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔ یہ نقشہ ہمارے سیاست دانوں کے منظر کو بیان کرتا ہے کہ چولستان میں قحط سالی پر فکرمند احباب خنک کمروں میں اور منرل واٹر کی بوتلوں سے پانی پیتے ہوئے چولستان کی پیاس پر بات کر رہے ہیں۔ اُردو کانفرنس کے مندوبین ہوائی سفر سے آ رہے ہیں، فائیو سٹار ہوٹلوں میں قیام و طعام ہے، خوب مسائل اُجاگر ہوں گے لیکن سماجی اور معاشرتی سطح پر موجود حقائق بتاتے ہیں کہ ہمارے ادبی ادارے چھابڑی میں تبدیل ہو چکے ہیں اور ممکن ہے کہ اس چھابڑی لگانے کا ماہانہ نہ دے سکنے پر یہ چھابڑی اُٹھا لی جائے۔ اس تکلیف دہ منظر کا مشاہدہ استادِ گرامی ڈاکٹر انوار احمد اور برادرم ڈاکٹر قاضی عابد نے بھی کیا ہے۔

(خالد سنجرانی۔ لاہور)

''انگارے'' (ماہ فروری ۲۰۰۵ء) موصول ہوا۔ میں نے آپ کا اداریہ دیکھا۔ کہا گیا ہے کہ اس میں ترقی پسند ادب کا منہ چڑایا گیا ہے۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں اس کی واضح نشان دہی کی درخواست کی تھی۔ کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ گول مول باتیں مناسب نہیں ہوتیں۔ ''انگارے'' بلاشبہ ایک غیر متعصب پرچہ ہے۔ اسے اسی طرح رکھیے۔ درسب کے لیے کھلے رکھیں۔ کوئی درست سمت کا تعین صرف مباحث ہی سے ہو سکتا ہے۔

مشفق خواجہ ہمارے ادب کی ایک قیمتی شخصیت تھے۔ ڈاکٹر انوار کا فوری مضمون شائع کر کے

آپ نے اچھا کام کیا ہے۔ مضامین میں ڈاکٹر شگفتہ کا مضمون ''جمالیات کیا ہے؟'' بھرپور نہیں جمالیات کی واضح definition بھی ہونا چاہیے تھی۔

ممتاز اطہر صاحب ہمارے دور کے اچھے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی نظمیں دل خوش کن لگیں۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ نظم ختم کس طرح کی جاتی ہے۔ مجھے ان کی چند نظمیں خصوصیت سے پسند آئیں۔ ''گمشدہ سمتوں کی دھند میں''، ''مسمار ہوئے عہد میں''، ''نظم ہونے سے ذرا پہلے'' بس ان کی طوالت مجھے ضرورا کھری ہے۔ افسانوں میں ''مسجد کی آنکھیں'' کا اختتام کوشش سے اور اچھا ہوسکتا تھا۔ لیاقت علی صاحب کا افسانہ ''خلش'' عمدگی سے نہیں لکھا جاسکا۔

شاعری کا حصہ اس بار غیر ضروری طور پر طویل دکھائی دیا اور غیر معیاری غزلیں شریک نظر آئیں۔ ماسوا ایک دو کے کسی نے متاثر نہیں کیا۔ تازہ اذہان کو ضرور جگہ دیں مگر ان کے ٹیلنٹ کو دیکھ کر۔

خطوط میں جناب ڈاکٹر انور سدید اور محترمی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے خطوط پڑھنے والے ضرور تھے مگر ان دونوں کی Tussle کچھ اچھی نہیں لگی۔ دونوں شخصیتیں پیاری ہیں۔ دونوں کا ادب میں اچھا contribution ہے۔ انور سدید صاحب عمر کی اس منزل پر ہیں جہاں تعقل کا راج ہوتا ہے۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو مشفقانہ انداز میں مسکرا کر ٹال دینا چاہیے۔ ہمارے دل میں ان کی بہت محبت ہے۔ ان کا دل کچھ مجھ سے بھی برا ہوگیا ہے (سہ ماہی روشنائی میں ان کا خط اس کی تصدیق کرتا ہے) حالاں کہ وہ یقین کریں میں انہیں اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ وہ چند ایسے بڑے نقادوں میں سے ہیں جنہوں نے گاہے گاہے میری سمت توجہ کی ہے ورنہ بقیہ کو اس کی توفیق خدا نے کبھی نہیں دی جب کہ میں نے ان کے ممدوحین سے کہیں اچھا لکھا ہے اور لکھ رہا ہوں مگر ''دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے'' خدا سدید صاحب کو سلامت رکھے ہم ان کے لیے دعا گو ہیں وہ مایوسانہ گفتگو نہ کیا کریں۔

منٹو نمبر مختصر ہوتے ہوئے بھی اچھا تھا۔ ویسے میرے مضمون پر رائے دیتے ہوئے جناب انور سدید نے یہ جملہ لکھ کر (احمد صغیر صدیقی نے منٹو پر ''ذاتی تنومندی'' سے لکھا ہے) ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ میں ان سے کسی اور جملے کی توقع لیے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب بھی جذباتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے پرچے کے بارے میں اظہار خیال سے زیادہ تمام تر توجہ فروعی باتوں پر لگا دی۔ میری خواہش ہے وہ اپنے تازہ مضامین سے ''انگارے'' کو ضرور نوازیں۔ ادیب ادب تخلیق کرتا ہوا ہی خوبصورت لگتا ہے۔ وہ خوبصورت آدمی ہیں اور ان کی تحریر میں بھی حسن ہوتا ہے۔ خدا آپ کو مزید کامیابیوں سے سرفراز کرے۔

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

''انگارے'' کا شمارہ تازہ موصول ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے انگارے میں شرکت کا۔ پرچہ

ماشاءاللہ خوب ہے دیدہ زیب ہے۔ نفاست کتابت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مضامین اچھے لگے۔ حصیر نوری کی غزلیں پسند آئیں۔ کہنہ مشق اور فکر کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں معنی آفرینی ہوتی ہے اور بھی غزلیں پڑھیں سب کے یہاں کوئی نہ کوئی شعر عمدہ پایا گیا کسی غزل میں ایک آدھ شعر ہی تو ہوتے ہیں بقیہ اشعار انہیں کے زیر اثر پرتو نشاں ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

(شارق بلیاوی۔ کراچی)

''انگارے'' شمارہ جنوری (منٹو نمبر) آپ نے یہ بڑا اہم کام کیا ہے اور وہ بھی بہت کم وقت میں مضامین میں ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر شگفتہ حسین، ایم خالد فیاض کے مضامین بہت عمدہ ہیں۔

''انگارے'' شمارہ فروری کا سرورق خوب صورت ہے۔ ممتاز اطہر کی نظموں نے بڑا مزہ دیا۔ ممتاز اطہر کی نظمیں بڑی جاندار، الگ اور چونکا دینے والی ہیں۔ آپ کا مضمون نئی سمتوں کا سفر اچھا تاثر قائم کرتا ہے۔ سندھی ادب سے افسانہ ''مسجد کی آنکھیں'' متاثر کرتا ہے۔ غزلوں میں خاور اعجاز کی غزلیں قابل داد ہیں۔

(خالد ریاض خالد۔ ملتان)

''انگارے'' کا تازہ شمارہ ملا۔ پڑھا۔ سچ جانیے تو افسوس ہوتا ہے کہ ''انگارے'' کے پچھلے شمارے کیوں نہ پڑھ سکا۔ آپ کا پرچہ ڈاکٹر شاہ محمد مری کے پاس دیکھتا رہا، لیکن پڑھنے سے محروم رہا۔ خصوصی طور پر ابنِ حسن صاحب کی تحریر ''ادب اور معروضی حقیقت'' ایک بہترین تحریر ہے۔ مارکسی تنقید میں حسرت رہی ہے کہ سٹوفر کاڈویل کو پڑھا جائے، لیکن اپنی انگریزی واجبی سی ہے۔ لہٰذا ترجمہ کا انتظار ہے۔ ابنِ حسن صاحب کا مذکورہ مضمون جس کی میں چند قسطیں ہی پڑھ پایا ہوں تفہیم جمالیات کے ساتھ ساتھ فلسفہ بیگانگی پر اچھی تحریر ہے۔

''جمالیات کیا ہے؟'' شگفتہ حسین کے ترجمہ میں پڑھی۔ مصنفہ نے مختصر تحریر میں بڑے موضوع پر لکھا ہے، اس لیے کچھ تشنگی سی باقی رہ گئی۔

آپ نے میری ترجمہ کہانی چھاپی۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ پندرہ برس پہلے سندھی میں ایک افسانوی مجموعہ ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس سے میں نے کئی تراجم کیے ہیں۔ ایک آپ نے پہلے ''ہولی'' کے نام سے چھاپ دیا۔ اب اسی کتاب سے امر جلیل کا ایک اور افسانہ ''عورت'' بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ قبول ہوگا۔

(ننگر چنا۔ کوئٹہ)

''انگارے'' شمارہ فروری ۲۰۰۵ء موصول ہوا۔ اس سے پہلے منٹو نمبر ملا۔ منٹو نمبر پر میں نے جسارت سنڈے میگزین میں اور اظہار کراچی میں تبصرہ کیا تھا۔ سنڈے میگزین جسارت اردو کے بہت ہی اچھے اور بانکے شاعر اجمل سراج ایڈٹ کرتے ہیں اور میں نے تقریباً ہر ''انگارے'' پر اس میں تبصرہ کیا ہے۔

مشفق خواجہ کی موت ایک نہ بھولنے والا سانحہ ہے اور میری مشفق خواجہ سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی کہ ایک اتوار کو میں اور کرن سنگھ اُن کے دفتر علم گئے۔ جب تعارف ہوا تو وہ مجھے یوں پہچان گئے جیسے میں برسوں سے اُن کا شناسا ہوں۔ اُن کی محبت اور اپنائیت نے دل میں اپنا احترام پیدا کیا۔ میرے تھیسس کے حوالے سے انہوں نے بہت سے مشورے دیئے اور چند لمحوں بعد وہ ایک صاحب کی تاریخی کتاب کی غلطیوں پر روشنی ڈال رہے تھے۔ ساتھ ساتھ فقرے بھی جاری تھے۔ رفیق نقش آئے تو ترجمے کے حوالے سے اُن کے ساتھ گفتگو فرمانے لگے۔ اُن کے چاروں طرف ریکوں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں اور لوگوں کا اِک ہجوم ان کے علم سے فیضاب ہو رہا تھا کہ بھری بزم سے اُٹھ گئے۔ ان کے اس طرح چلے جانے کا ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس حوالے سے کرن سنگھ نے خوب کہا کہ ''اب شہر میں کون، ہم جس کے پاس جائیں اور لمحوں میں ہمارے سوالوں کے جواب مل جائیں واقعی مشفق خواجہ کتاب نہیں چلتی پھرتی کتابیات تھے۔ انہی کی طرح ایک اور شفیق مہربان اور باعلم شخصیت جناب پروفیسر سحر انصاری کی ہے (اللہ تعالیٰ اُن کی زندگی دراز کرے) جن کے پاس جب بھی کوئی سوال لے کر جائیں وہ بہت ہی شفیق لہجے میں رہنمائی فرماتے ہیں۔ حکومت سندھ اور پاکستان کو چاہیے کہ انہیں کسی ادارے یا اکیڈمی کا سربراہ بنائے۔ اُن کی علمیت سے بھرپور استفادہ کرے۔ میں ''انگارے'' کی وساطت سے اعلیٰ ارباب اقتدار تک یہ بات پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ مشفق خواجہ کی طرح وہ بھی گوشہ نشیں ہو جائیں اور انہیں ان کا جائز مقام و مرتبہ مل سکے۔

لوگ ہر بات میں بدنیتی اور اپنے اندر بھرے کھوٹ کی طرح جھوٹ اور افترا پردازی کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں مگر آپ یقین کریں کراچی میں چند شخصیات ہی ایسی ہیں جو علم دوست ہیں اور ان میں سحر انصاری سب سے بلند مقام پر فائز ہیں۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر سحر انصاری کی علمیت اور دانشوری کو سب ہی مانتے ہیں۔ کہنے کا اور اس طویل داستان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آج سحر انصاری تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انہیں ان کا جائز مقام مل سکے۔ جس کے راستے جعلی دانشوروں نے روک رکھے ہیں اور جعلی ڈگریوں کی روکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔

موجودہ شمارے میں شگفتہ حسین کا جمالیات کا تعارفی مضمون اور روبینہ شاہین کا مطالعہ بہت خوب ہیں۔ شگفتہ حسین نے کوزے میں سمندر بند کر دیا ہے حالانکہ خواتین کوزے کو سمندر بناتی ہیں مگر

انہوں نے ہزاروں صفحات پر پھیلے مباحث چند اوراق میں سمیٹ کر کارنامہ کیا ہے اگر وہ اسی طرح تمام فکری تحریکوں کا تعارف پیش کر سکیں تو ہم جیسے کاہلوں کو سہولت ہو جائے گی جو کم پڑھنے کے عادی ہیں۔

ممتاز اطہر کا خصوصی مطالعہ شائع کر کے آپ نے قابلِ ذکر کام کیا ہے۔ ممتاز اطہر کی نظمیں برگِ سبز کی طرح تحفۂ درویش ہیں اُن کی نظموں کا اُسلوب منفرد اور فضا اپنی ہے۔ شاعری کے باب میں کیا کہوں۔ میں خود قتیل سخن ہوں، میں کیا، میری رائے کیا۔

ہاں ننگر چنا اور خالد فتح محمد کے تراجم اچھے لگے۔ مجموعی طور پر ''انگارے'' کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ آپ کی کاوش اور کوششیں لائق صد تحسین ہیں۔

(فہیم شناس کاظمی۔ نواب شاہ)

☆☆☆